الرسالہ

Al-Risala

February 2001 • No. 291 • Rs. 10

ہر مسئلہ قابل حل ہے، سوا اس مسئلہ کے جس کو
وقار کا مسئلہ بنا دیا جائے۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128,
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

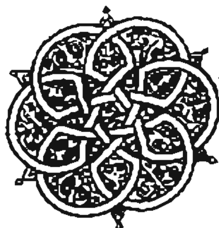
DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Street,
Ft. Lauderdale, FL 33328
U.S.A. Tel./Fax 718-2583439
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

الرسالہ، فروری ۲۰۰۰

فہرست



الدین کیا ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں ارشاد ہوا ہے: شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحاً والذی اوحینا إلیك وما وصینا بہ ابرھیم و موسی وعیسی أن اقیموا الدین ولاتتفرقوا فیہ کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب۔ (الشوریٰ ۱۳) یعنی اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔ مشرکین پر وہ بات بہت گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلا رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف چن لیتا ہے۔ اور وہ اپنی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں الدین سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا مطلب کیا ہے۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دین کا لفظ، بہت سے دوسرے الفاظ کی طرح، ایک سے زیادہ معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً دین بمعنی جزاء (الفاتحہ ۳) دین بمعنی قانون (یوسف ۷۶) دین بمعنی اطاعت (النساء ۱۲۵) دین بمعنی مذہب (الکافرون ۶)، وغیرہ۔

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس آیت میں اقیموا الدین کا مطلب یہ ہے کہ دین کو ان سارے ہی معنوں میں قائم کرو۔ ایسا کہنا بلاغت کلام کے خلاف ہے۔ بلاغت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ لغت کے اعتبار سے اگر ایک لفظ کے کئی معنی ہوں تب بھی جب وہ کسی عبارت میں استعمال ہوگا تو اس عبارت میں وہ اپنے صرف ایک معنی میں مراد ہوگا جو کہ سیاق (context) سے متعین ہو رہا ہو۔

مزید یہ کہ ایسا کہنا عقلی اعتبار سے ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ ایسی حالت میں اقیموا الدین کی تشریح میں دوسرے مفہومات کے ساتھ یہ بھی شامل کرنا پڑے گا کہ تم روز جزاء کو قائم کرو،

کیوں کہ دین کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ حالانکہ روز جزاء کو قائم کرنا اللہ کا مخصوص معاملہ ہے، وہ سرے سے انسان کے بس ہی میں نہیں۔

اب غور کیجئے کہ سورہ الشوریٰ کی مذکورہ آیت کا سیاق کلام کیا ہے اور سیاق کے اعتبار سے یہ لفظ یہاں کس متعین مفہوم میں آیا ہے۔

اس پہلو سے غور کرتے ہوئے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس آیت میں ایک ایسے الدین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام کے سوا دوسرے پیغمبروں پر بھی یکساں طور پر اترا تھا۔ آیت یہ حکم دیتی ہے کہ تم متفرق ہوئے بغیر اسی واحد اور مشترک دین پر عمل کرو اور اس پر پوری طرح قائم ہو جاؤ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اسلام پر اترے ہوئے تمام احکام یہاں مراد نہیں ہو سکتے۔

آیت کے الفاظ کے مطابق، یہاں اقیموا الدین میں دین کا صرف وہ حصہ مراد ہوگا جو "شریعت" کے علاوہ ہے۔ کیوں کہ شریعت کے متعلق واضح طور پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مختلف پیغمبروں کی شریعتیں الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف تھیں (المائدہ ۴۸) ایسی حالت میں تمام پیغمبروں کی مشترک پیروی صرف ان امور دین میں ہو سکتی ہے جو شریعت اور منہاج کے علاوہ ہیں، اور جن میں ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

اس آیت میں قرآن کے تمام مفسرین نے بلا استثناء اقیموا الدین کا یہی مفہوم لیا ہے۔ مستند مفسرین میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اقیموا الدین کی آیت کا یہ مطلب بتائے کہ شرائع سمیت تمام دینی احکام کو قائم کرو۔ اس کے برعکس ہر مفسر یہ کہتا ہے کہ شرائع کے سوا جو اساسی دین ہے اور جس میں پیغمبروں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، اس دین مشترک کو قائم کرو۔ ملاحظہ ہو ــــ مدارك التنزيل، روح المعانی، تفسير كبير، البحر المحيط، الخازن، الجامع لاحكام القرآن، تفسير ابن كثير، تفسير ابن جرير الطبری، تفسير النسفی، التفسير المظهری، وغیرہ۔

یہاں مثال کے طور پر ایک تفسیری اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔القرطبی (وفات ۶۷۱) نے اپنی عربی تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ یہ ہے: اقیموا الدین سے مراد ہے اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت۔اور ایمان لانا اس کے رسولوں پر اور اس کی کتابوں پر اور یوم جزاء پر۔اور ان تمام چیزوں پر جس کی اقامت سے آدمی مسلم ہوتا ہے۔اور یہاں شرائع مقصود نہیں جو امتوں کے احوال پر مبنی مصالح سے تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ شرائع مختلف اور متفرق ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے شریعت اور منہاج الگ الگ مقرر کیا۔

پس اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد ہم نے تم کو اور نوح کو ایک ہی دین کا حکم دیا ہے۔یعنی وہ اصول جن میں شریعتوں کا اختلاف نہیں۔اور وہ ہے توحید اور صلاۃ اور زکاۃ اور صیام اور صالح اعمال کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنا۔اور سچائی اور ایفائے عہد اور امانت کی ادائیگی اور صلۂ رحم۔اور کفر اور قتل اور زنا کو حرام جاننا اور انسانوں کو تکلیف پہنچانا اور حیوانات کو ستانا اور برائیوں میں مبتلا ہونا، پس یہ سب کی سب دین واحد کی حیثیت سے مشروع ہیں۔ان میں انبیاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں خواہ ان انبیاء کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۶/۱۱)

معلوم ہوا کہ سیاق اور تمام مفسرین کی رائے کے مطابق، اقیموا الدین کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "مکمل دین بشمول شرائع کو زمین پر قائم کرو" بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد مسلم سے جو کچھ اس کی انفرادی حیثیت میں مطلوب ہے اس پر وہ مکمل طور پر قائم ہو جائے۔ قرآن کی اس آیت کا خطاب در اصل فرد سے ہے نہ کہ پورے نظام اجتماع سے۔ جہاں تک اجتماعی نظام کا تعلق ہے، وہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے اور اس معاملہ میں جو کچھ مطلوب ہے اس کا حکم دوسری آیتوں اور حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے اور وہیں اس کو دیکھنا چاہئے۔ جہاں تک سورۂ الشوریٰ کی مذکورہ آیت کا تعلق ہے وہ ایک فرد کی دین داری کو بتا رہی ہے اور یہی چیز اس آیت سے اخذ کرنا چاہئے۔

یہ مسئلہ در اصل اس اصول سے تعلق رکھتا ہے کہ کس آیت سے کون سا حکم اخذ کیا جائے۔ مثال کے طور پر آیت صلوۃ سے صلوۃ کا حکم نکالا جائے گا نہ کہ حج اور جہاد کا۔ اسی طرح جس آیت میں فرد کی داخلی ذمہ داریوں کو بتایا گیا ہو اس آیت سے امت کی خارجی ذمہ داریوں کا حکم نکالنا درست نہیں ہو سکتا۔

قرآن کی جس آیت میں جو حکم آیا ہے، جب اس آیت سے وہی حکم نکالا جائے تو دین میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوگا۔ دین کے تمام تقاضے اپنی جگہ درست طور پر قائم رہیں گے۔ اس کے برعکس جب کسی آیت سے وہ حکم نکالا جائے جو اس خاص آیت میں نہیں ہے تو یہ طریقہ وضع الشیٔ فی غیر موضعه کا مصداق بن جائے گا اور حکم کا اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔

مثال کے طور پر قرآن کی ایک آیت یہ ہے: یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط (النساء ۱۳۵) اس آیت میں مسلمانوں کی ذاتی ذمہ داری کی بابت ایک حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو، تم اپنی ذاتی زندگی میں خوب خوب انصاف پر قائم رہنے والے بنو۔ یہ آیت فرداً فرداً ہر مسلمان کو اس کی اپنی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔

اب اگر اس آیت سے خارجی اور سیاسی معنوں میں نفاذ انصاف کا حکم نکالا جانے لگے تو اس کا رخ بالکل بدل جائے گا۔ اب ہر مسلمان اپنی ذات کو نشانہ بنانے کی بجائے باہر کے سیاسی حکمرانوں کو اپنے عمل کا نشانہ سمجھ لے گا۔ اس کو یہ فکر تو نہ ہوگی کہ وہ اپنے ذاتی معاملات کو تقویٰ اور انصاف پر قائم کرے البتہ وہ اس پُر شور اعلان کے ساتھ سڑکوں پر نکل پڑے گا کہ مجھے ساری دنیا میں اسلام کے عدل کا جھنڈا گاڑنا ہے۔ مجھے ان تمام سیاسی طاقتوں سے لڑنا ہے جو اسلامی عدل کے زمینی نفاذ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ ذاتی احتساب کا جذبہ اس کو نہیں تڑپائے گا، البتہ وہ یہ نعرہ لگاتا ہوا دوسروں کے خلاف گن کلچر چلا دے گا کہ:

ہے حقیقت میرے دیں کی احتساب کائنات

اس طرح دین کے نام پر ایک ایسی بے دینی پیدا ہوگی جہاں دین کے نام پر پر شور ہنگامے ضرور

ہوں گے مگر وہی چیز موجود نہ ہو گی جس کے نام پر سارا ہنگامہ کھڑا کیا گیا ہے، یعنی ـــــ اللہ کی مطلوب دین داری۔

اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اقیموا الدین کی آیت قرآن کی سورۃ الشوریٰ میں آئی ہے۔ یہ سورۃ ثابت شدہ طور پر ایک مکی سورہ ہے، یعنی وہ اس زمانہ میں اتری جب کہ قرآن کے بیشتر حصے ابھی نازل ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور قرآن کا وہ حصہ جو شرائع اور احکام سے تعلق رکھتا ہے وہ ابھی اہل ایمان کو دیا نہیں گیا تھا۔

آیت کا یہ زمانۂ نزول حتمی طور پر بتاتا ہے کہ اقیموا الدین کی آیت میں الدین سے مراد ''مکمل دین'' نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس وقت وہ سرے سے اترا ہی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جو احکام ابھی نازل نہ ہوئے ہوں ان کو قائم کرنے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی مکی سورتوں میں اقیموا الصلوۃ کا حکم ہے۔ اس آیت کا مفہوم بوقت نزول یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پنج وقتہ نماز باجماعت قائم کرو کیوں کہ پنج وقتہ نماز باجماعت کا حکم اس وقت اہل ایمان کو دیا ہی نہیں گیا تھا۔ اسی طرح اقیموا الدین میں بھی سیاسی اور قانونی احکام مراد نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں یہ احکام نازل ہی نہیں کئے گئے تھے۔

اسی طرح سورۃ الشوریٰ کی مذکورہ آیت میں دوسرے پیغمبروں کا بھی ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کو بھی اسی الدین کے قائم کرنے کا حکم ملا تھا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے حضرت موسیٰ کے سوا دوسرے پیغمبروں کو سرے سے سیاسی اور قانونی احکام دئے ہی نہیں گئے تھے۔ حتی کہ، ان کی زندگی کے آخری زمانہ میں بھی نہیں۔ ایسی حالت میں ان سابق پیغمبروں کو یہ حکم دینا کہ تم لوگ ''مکمل دین'' کو زمین پر قائم اور نافذ کرو، اور بھی زیادہ ناقابل فہم ہے۔ خدا کی شریعت میں ذمہ داری تکلیف بقدر وسع کے اصول پر مبنی ہے۔ اہل ایمان کے لئے مکی دور میں اور دوسرے اکثر انبیاء کے لئے ان کی پوری زندگی میں ''مکمل دین'' کا نفاذ ان کی وسع سے باہر تھا۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس وقت انہیں اس کا مکلف قرار دیا جائے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقیموا الدین میں دراصل انفرادی دین پر قائم ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی وہ دین جس کو ایک شخص ہر جگہ اور ہر صورت حال میں اختیار کر سکتا ہے۔ جو بات یہاں سورۃ الشوریٰ میں جمع کے صیغہ میں کہی گئی ہے وہی بات دوسری جگہ واحد کے صیغہ میں اس طرح آئی ہے: واقم وجهك للدين حنيفا۔ (الروم ۳۰)

اقیموا الدین یا اقم وجهك للدين حنيفا کا مطلب یہ ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ جو حقیقت تمہارے اوپر منکشف ہوئی ہے، اس کو اپنے دل و دماغ کا حصہ بنالو۔ تمہاری سوچ اسی میں ڈھل جائے، وہ تمہارے ذہن میں سما جائے، وہی تمہاری ساری توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہو۔

اس معرفت کے بعد یہ ہونا چاہئے کہ تمہاری پوری ہستی خداوند عالم کے آگے جھک جائے۔ تم اسی کے عبادت گزار بن جاؤ۔ تمہارا وجود اس کے ذکر و تسبیح میں سرشار ہو جائے۔ خدائے واحد ہی تمہارے خوف و محبت کے تمام جذبات کا مرکز بن جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ آدمی کا یہ تعلق اتنا زیادہ گہرا ہو جائے کہ اس کے اخلاق و عادات اسی میں ڈھلنے لگیں۔ اس کی بولی میں خدا کا نور شامل ہو۔ اس کا عملی سلوک عبدیت کے رنگ میں رنگ جائے۔ لوگوں کے درمیان وہ ایک ایسے انسان کے روپ میں رہنے لگے جس میں خدا ترسی اور آخرت کی جواب دہی کا احساس سمایا ہوا ہو۔

اس کی زندگی دو عملی سے خالی ہو۔ اس کا کردار اعلیٰ اصولوں سے متعین ہوتا ہو نہ کہ محض مصلحت اور مفاد کے تحت۔ وہ لوگوں کے ساتھ عدل کا برتاؤ کرے۔ اس کا دل کینہ اور حسد اور انتقام سے پوری طرح خالی ہو۔ وہ ہر حال میں سچ بولے۔ خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ لوگوں کے درمیان ایک ایسے انسان کی طرح رہے جو جہنم سے ڈرتا ہو اور جنت میں داخلہ کا حریص ہو۔

وہ اعتراف کرنے والا ہو نہ کہ سرکشی کرنے والا۔ اس کا سینہ تواضع سے بھرا ہوا ہو نہ کہ سرکشی سے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لئے خیر خواہی ہو نہ کہ بدخواہی۔ وہ امانت پر قائم رہنے

والا ہو اور خیانت سے پاک ہو۔ وہ عیب جوئی، الزام تراشی سے پاک ہو اور ہمیشہ وہ بات کہے جو ٹھیک ٹھیک حق وانصاف کے مطابق ہو۔

اس کی معرفت حق اس کو مادیت سے اوپر اٹھادے اور اس کو روحانیت کی بلند تر دنیا میں جینے والا بنادے۔ اس کو یاد آئے تو خدا کی یاد آئے۔ اس کو شوق ہو تو خدا کے آغوش رحمت کو پانے کا شوق ہو۔ اس کو حرص ہو تو جنت کی حرص ہو۔ اس کو تعلق ہو تو ان بندوں سے تعلق ہو جو اس کے لیے خدا کی راہ میں مددگار بننے والے ہوں۔

اس کی نظر میں اتنی گہرائی آجائے کہ وہ ظاہر میں باطن کو دیکھنے لگے۔ تخلیق کے مناظر میں وہ خالق کا مشاہدہ کرنے لگے۔ دنیا کی ہر چیز اس کے لئے خدا کی صفات کمال کا تعارف بن جائے۔ اس کی حق شناسی اتنی بڑھے کہ ساری پھیلی ہوئی کائنات اس کے لئے رزق ربانی کے حصول کا دستر خوان بنی ہوئی ہو۔ ہر چیز میں اس کو اضافۂ ایمان کی خوراک ملنے لگے۔

خلاصہ یہ کہ **اقیموالدین** یا **اقم وجهك للدين حنيفا** سے مراد دین کو زمین پر قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو خود اپنے آپ پر قائم کرنا ہے۔ اس سے مراد احتساب خویش ہے نہ کہ احتساب غیر۔ اس سے مراد خود اپنے آپ کو خدا کے حکم کے تابع کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو خدا کے تابع بنانے کے نام پر ان سے جنگ چھیڑنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی آنکھیں اللہ کی یاد سے آنسو بہانے لگیں نہ کہ وہ دوسروں کے اوپر تلوار چلا کر ان کا خون بہائیں۔ اقیموالدین کا مطلب اپنی دنیا کو معرفت الٰہی سے آباد کرنا ہے نہ کہ خدائی حکومت قائم کرنے کے نام پر دنیا کو تشدد اور نفرت کا جنگل بنانا۔ اقیموالدین کا مطلب اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے نہ یہ کہ آدمی اطاعت رب کا نظام قائم کرنے کے نام پر ساری دنیا کو نفرت اور فساد سے بھر دے۔

مذکورہ قرآنی آیت میں اقامت دین سے مراد پیروی دین ہے نہ کہ نفاذِ دین۔ اس کا نشانہ احتساب خویش ہے نہ کہ احتساب غیر۔ یہ فکری اور اخلاقی دنیا میں کی جانے والی ایک جدوجہد ہے نہ کہ سیاست اور حکومت کے دائرہ میں برپا کیا جانے والا خارجی ہنگامہ۔

شریعت اور دین کا فرق

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ارشاد ہوا ہے: لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا ولو شاء الله لجعلكم امة واحدة ولكن ليبلوكم في ما اتاكم فاستبقوا الخيرات الى الله مرجعكم جميعاً فينبئكم بما كنتم فيه تختلفون (المائدہ ۴۸) یعنی ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریقہ ٹھہرایا، اور اگر خدا چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اللہ نے چاہا کہ وہ اپنے دئے ہوئے حکموں میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تم کو آگاہ کر دے گا اس چیز سے جس میں تم اختلاف کر رہے تھے۔

قرآن میں ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا الدین ایک ہے اور وہ ہر پیغمبر کے پاس اسی ایک صورت میں بھیجا گیا (الشوریٰ ۱۳)۔ دوسری طرف قرآن کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اور منہاج کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے فرق رکھا ہے۔ مختلف پیغمبروں کو مختلف شریعت اور مختلف منہاج دیا گیا۔ قرآن کی یہ آیت مطلق مفہوم میں نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر نبی کی شریعت ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فرق یا اختلاف صرف جزئی اور فروعی پہلو سے تھا نہ کہ کلی اور عمومی پہلو سے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں شرعة اور منہاج کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ شرعة یا شریعت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو آدابِ عبادت کہا جا سکتا ہے اور منہاج سے مراد طریق کار (method) ہے۔

اصل یہ ہے کہ عبادت کی ایک روح یا ایک حقیقت ہے۔ مثلاً قرآن کے مطابق نماز کی حقیقت خشوع ہے اور روزہ کی حقیقت شکر ہے، عبادت کی یہ داخلی حقیقت کبھی نہیں بدلتی۔ البتہ

اسی کے ساتھ ہر عبادت کی ایک ظاہری صورت (form) ہے۔ دراصل عبادت کا یہی ظاہری فارم ہے جس میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ وہ کسی پیغمبر کو ایک صورت میں دیا گیا اور دوسرے پیغمبر کو کسی اور صورت میں۔

آداب عبادت یا ظواہر عبادت میں فرق کی ایک مثال وہ ہے جو قبلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے امت یہود کے لئے بیت المقدس (یروشلم) کو ان کا قبلۂ عبادت بنایا گیا تھا۔ لیکن امت محمدی کا قبلۂ عبادت کعبہ کو مقرر کیا گیا جو مکہ میں واقع ہے۔

منہاج سے مراد طریق کار ہے۔ مختلف پیغمبروں کو مختلف منہاج (طریق کار) دیا گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہر پیغمبر کے حالات الگ تھے۔ اور طریقہ کار وہی درست ہو سکتا ہے جس میں وقت کے حالات کی رعایت کی گئی ہو۔ منہاج میں فرق کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام قدیم مصر میں آئے۔ انہوں نے اپنے ہم عصر بادشاہ سے براہ راست طور پر کہا کہ اجعلنی علی خزائن الارض (یوسف ۵۵) یعنی مجھ کو ملک کے خزائن پر مقرر کر دو۔ لیکن اسی ملک مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے، مگر انہوں نے اپنے ہم عصر بادشاہ سے اس قسم کا مطالبہ نہیں فرمایا، بلکہ برعکس طور پر یہ کہا کہ مجھ کو اجازت دے کہ میں اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر ملک مصر سے باہر چلا جاؤں۔ (الشعراء ۱۷)

شریعت میں فرق کی یہ توجیہہ کرنا درست نہیں کہ ایسا بربنائے ارتقاء ہوا ہے۔ یعنی پچھلے پیغمبروں کی شریعت سادہ شریعت تھی۔ پھر ان میں ترقی ہوتی رہی۔ گویا اگلے پیغمبر کی شریعت میں پچھلے پیغمبر کے مقابلہ میں فرق کا سبب یہ تھا کہ اگلے پیغمبر کی شریعت پچھلے کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ یہ ارتقائی فرق جاری رہا۔ یہاں تک کہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کو آخری ارتقاء یافتہ شریعت دے دی گئی۔

شریعتوں میں فرق واختلاف کی یہ ارتقائی توجیہہ درست نہیں۔ خود مذکورہ آیت اس نقطۂ نظر کی تردید کر رہی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں شریعتوں میں فرق کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا اس

لئے کیا گیا تاکہ اللہ لوگوں کو آزمائے (لیبلو کم فی ما آتا کم)۔ یعنی خود قرآن کے بیان کے مطابق، مختلف پیغمبروں کی شریعتوں میں فرق بر بناء ابتلاء تھانہ کہ بر بناء ارتقاء۔

اصل یہ ہے کہ ہر عبادتی فعل کی ایک روح ہوتی ہے اور دوسرے، اس کا ظاہری ڈھانچہ۔ ابتداء میں جو لوگ ایمانی زندگی اختیار کرتے ہیں وہ اس فرق کو جانتے ہیں اس لئے وہ روحِ عبادت کے معاملہ میں زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن بعد کی نسلوں میں دھیرے دھیرے جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے اندر داخلی روح باقی نہیں رہتی۔ وہ ظواہر عبادت کو اصل سمجھ لیتے ہیں۔ اور بس اس کی ظاہری تکمیل کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے عبادت کا فعل انجام دے دیا۔

جب امتوں سے روح دین نکل جاتی ہے اور اس کے افراد جمود میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ذریعہ بعض ظواہر میں تبدیلی کا حکم دے دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ظواہر ہی کو اصل سمجھ لیا تھا وہ انہی قدیم ظواہر سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ نئ عبادتی شکل کو قبول نہیں کر پاتے۔ حتی کہ اس بنا پر وہ اپنے ہم زمانہ پیغمبر کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے اندر روحِ دین زندہ ہوتی ہے وہ ظواہر کے فرق کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ دل کی آمادگی کے ساتھ قدیم فارم کو چھوڑ کر نئے فارم کو اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی معاملہ قدیم مدینہ میں اس وقت پیش آیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قبلۂ عبادت کو بدل دیا گیا۔ (البقرہ ۱۴۲)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یہ عمل جزئی طور پر جاری ہے۔ جہاں تک عبادات کے ظواہر کا تعلق ہے، ان میں اب تبدیلی ممکن نہیں کیوں کہ عبادت کے ظواہر میں تبدیلی کا معاملہ اجتہادی نہیں ہے۔ اس قسم کی تبدیلی صرف پیغمبر کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اب چونکہ کوئی پیغمبر آنے والا نہیں، اس لئے اب عبادات کے ظواہر مین فرق یا تبدیلی کا پیش آنا بھی ممکن نہیں۔

مگر جہاں تک منہاج کا معاملہ ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ منہاج (طریق کار) کا معاملہ بنیادی طور پر اجتہاد پر مبنی ہے۔ اور چونکہ اجتہاد امت مسلمہ میں قیامت تک جاری رہے گا اس لئے منہاج کے معاملہ میں فرق یا تبدیلی بھی علماء مجتہدین کی رایوں کے مطابق مسلسل ہوتی رہے گی۔

قرآن (الانعام ۹۰) میں پیغمبر اسلام ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم دوسرے پیغمبروں کی پیروی کرو۔ (اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بار بار منہاج کے معاملہ میں پچھلے پیغمبروں کا انداز اختیار کیا۔ قرآن کے تتبع سے اس کی مثالیں معلوم کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مخالفین کے ایذاء پر صبر کی روش اختیار کرنا (الاحقاف ۳۵)۔ فتح مکہ کے بعد پیغمبر اسلام کا سنت یوسفی پر عمل کرنا اور زیادتی کرنے والوں کو یہ کہہ کر معاف کردینا کہ لا تثریب علیکم الیوم (یوسف ۹۲) وغیرہ۔

پیغمبروں کی شریعتوں میں فرق ہونا کوئی پر اسرار معاملہ نہیں۔ یہ معاملہ ایک ثابت شدہ قانون فطرت پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہ داعیوں کا عقیدہ یا ان کا نظریہ خواہ بالکل یکساں ہو، وہ خارجی حالات (circumstances) جن کے درمیان انہیں کام کرنا پڑتا ہے، کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ حتی کہ ایک پیغمبر کے اپنے زمانہ میں بھی حالات مختلف ہوسکتے ہیں۔ اس بنا پر بالکل فطری بات ہے کہ شریعت کے انطباق میں حالات کے اعتبار سے فرق ہو۔ مختلف پیغمبروں کی شریعتوں کا مختلف ہونا دراصل حالات کی رعایت ہی کا دوسرا نام ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے لئے جب مکہ میں حالات سخت ہوگئے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں۔ اس کے برعکس حضرت مسیح کے حالات بھی یروشلم میں سخت ہوگئے مگر انہیں یروشلم چھوڑ کر کہیں اور جانے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس فرق کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ اس وقت مدینہ کے حالات بتا رہے تھے کہ وہ مکہ سے بالکل مختلف ہیں اور یہاں بآسانی اسلام کا مرکز بنایا جاسکتا ہے۔ جب کہ حضرت مسیح کے

زمانہ میں یروشلم کے باہر مدینہ جیسی کوئی جگہ موجود نہ تھی، جہاں جاکر زیادہ بہتر حالات میں نیا دعوتی مرکز بنایا جاسکے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی میں حالات وواقعات کی جو ترتیب ہے وہ تاریخ اسلام کا ایک جزء ہے نہ کہ عقیدہ اسلام کا ایک حصہ۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام نے مکہ میں پر امن دعوت کے انداز میں کام کیا۔ اس کے بعد آپ خاموش طور پر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ اس کے بعد جہاد (بمعنیٰ قتال) کے واقعات پیش آئے اور آخر کار مکہ فتح ہو گیا۔ اب واقعات کی اس ترتیب کو لے کر اگر کوئی یہ کہے کہ اسلامی تحریک تین مرحلوں کا نام ہے ـــــ دعوت، ہجرت، جہاد، تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ ترتیب مقدس عقیدہ پر قائم نہیں ہے۔ اس کی یہ ترتیب تمام تر زمانی حالات نے قائم کی نہ کہ کسی غیر متغیر عقیدہ و نظریہ نے۔ اس کا تعلق منہاج سے ہے نہ کہ الدین سے۔ اس کی حیثیت تمام تر اضافی (relative) ہے۔ وہ حالات کی بنا پر بننے والی ایک تاریخ ہے نہ کہ عقیدہ کی بنا پر بننے والی ایک مقدس ترتیب۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، منہاج (method) میں فرق کا معاملہ صرف پچھلے نبیوں کے درمیان فرق کا معاملہ نہ تھا۔ یہ اصول ختم نبوت کے بعد بھی امت مسلمہ میں بدستور جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ منہاج میں فرق کا معاملہ جس اصول پر مبنی ہے وہ ایک ابدی اصول ہے، یعنی خارجی حالات میں فرق کا پیدا ہونا۔ حالات کا یہ فرق ہمیشہ مختلف صورتوں میں پیش آتا رہتا ہے۔ اس لیے منہاج میں فرق کی ضرورت بھی بار بار پیش آتی رہتی ہے۔

مثال کے طور پر قدیم زمانہ میں آمرانہ بادشاہت کا رواج تھا۔ تمام امور ایک جابر حکمراں کے اختیار میں ہوتے تھے اس بنا پر کسی خدا پرست گروہ کے لئے دینی زندگی گزارنا یا تو اس وقت ممکن ہوتا تھا جب کہ وہ حکمران کے دائرہ اقتدار سے باہر چلا جائے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ

السلام نے کیا۔ وہ مصر میں فرعونی اقتدار کے تحت اللہ واحد کی عبادت کرتے ہوئے پر امن زندگی نہیں گزار سکتے تھے، اس لیے وہ بنی اسرائیل کے پورے گروہ کو لے کر مصر سے باہر چلے گئے اور صحرائے سینا کے غیر آباد علاقہ میں قیام کیا اور وہاں بنی اسرائیل کے لئے ایک خدا پرستانہ معاشرہ کی تشکیل کی۔

دوسری مثال وہ ہے جو اصحاب رسول کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے زمانہ میں عرب سے متصل ایرانی شہنشاہیت (Sasanid Empire) اور رومی شہنشاہیت (Bazantine Empire) موجود تھیں۔ یہ دونوں شہنشاہیتیں سیاسی جبر کے اصول پر قائم تھیں۔ ان کے تحت یہ ممکن نہ تھا کہ ارباب توحید آزادانہ طور پر اپنے فرائض کو ادا کر سکیں۔ اس لئے خود ان شہنشاہیتوں کی جارحیت کے نتیجہ میں ان کے ساتھ اصحاب رسول کا ٹکراؤ پیش آیا۔ اللہ کی خصوصی مدد سے یہ ٹکراؤ کامیاب رہا۔ اس کے نتیجہ میں ان جابرانہ شہنشاہیتوں کا خاتمہ ہو گیا اور اہل توحید کو یہ موقعہ ملا کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

بیسویں صدی میں پہنچ کر دنیا کے حالات مکمل طور پر بدل گئے ہیں۔ نئے تاریخی عمل کے نتیجہ میں اب دنیا میں نہ شخصی حکمرانی ہے اور نہ جابرانہ سیاسی نظام۔ ۱۹۹۱ میں سوویت ایمپائر کا ٹوٹنا انسانی تاریخ میں نظام جبر کے خاتمہ کی آخری تکمیل تھی۔ اب اس قسم کا سیاسی جبر کبھی دنیا میں واپس آنے والا نہیں۔

سیاسی تبدیلی نے "منہاج" کے معاملہ کو انقلابی طور پر بدل دیا ہے۔ آج کے توحید پرستوں کو نہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت کریں اور نہ یہ ضرورت ہے کہ وہ وقت کے حکمرانوں سے مسلح ٹکراؤ کریں، تاکہ انہیں ختم کر کے اپنے لئے آزادانہ دینی زندگی کے مواقع حاصل کر سکیں، کیوں کہ یہ چیزیں تو اب تاریخی عمل کے نتیجہ میں اپنے آپ انہیں حاصل ہو چکی ہیں۔ اس انقلابی تبدیلی کے دو بڑے پہلو ہیں: (۱) مکمل مذہبی آزادی (۲) جدید وسائل۔

موجودہ زمانہ انسانی تاریخ کا پہلا زمانہ ہے جب کہ ایک طرف فکری انقلابات اور دوسری طرف اقوام متحدہ کے قیام کے نتیجہ میں ہر فرد اور ہر گروہ کا یہ ناقابل تنسیخ حق مان لیا گیا ہے کہ وہ مکمل طور پر یہ حق رکھتا ہے کہ جس مذہب کو چاہے مانے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے، صرف اس ایک شرط کے ساتھ کہ وہ دوسروں کے خلاف تشدد کا کوئی فعل نہ کرے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ پر امن مذہبی زندگی یا پر امن دعوت و تبلیغ کے راستہ میں آج کسی بھی قسم کی کوئی خارجی رکاوٹ موجود نہیں۔

قرآن میں اصحاب رسول کو یہ دعاء تلقین کی گئی تھی کہ اے ہمارے رب، تو ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر ڈالا تھا (البقرہ ۲۸۶) یہ گویا دعا کی صورت میں اس آنے والے دور کا پیشگی اعلان تھا جو پیغمبر آخر الزماں کی امت کے لئے اللہ نے مقدر کیا تھا۔ خاتمہ عسر کا یہ دور اب دنیا میں پوری طرح آچکا ہے۔

ایسی حالت میں آج کے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ نئے دور آزادی پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کا بھرپور استقبال کریں، نہ کہ وہ خود ساختہ نظریات کی بنا پر نئے دور کے سیاسی حکمرانوں سے غیر ضروری ٹکراؤ شروع کردیں اور پھر صحابیٔ رسول حضرت عبد اللہ بن عمر کے اس پیشگی انتباہ کا مصداق بنیں کہ ــــــ اللہ کی توفیق سے اصحاب رسول نے سیاسی فتنہ کا خاتمہ کر دیا تھا، مگر تم لوگوں نے اپنی نادان کارروائیوں کے ذریعہ سیاسی فتنہ کو دوبارہ اپنے خلاف زندہ کر لیا (صحیح البخاری ۳۲/۸)

اس سلسلہ میں دوسری اہم چیز جدید وسائل کا ظہور ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کے بعد ایسے نئے وسائل کار ظہور میں آئے ہیں جو اپنی تاثیر کے لحاظ سے اتنا زیادہ دوررس ہیں کہ اب سیاسی اقتدار عملاً ثانوی درجہ کی چیز بن گیا ہے۔ آج وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے جس کی امید قدیم زمانہ میں صرف سیاسی اقتدار کے ذریعہ کی جاسکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان وسائل کو حکمت اور بصیرت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو آج کی

دنیا میں ایسا دینی ایمپائر بنایا جاسکتا ہے جس کا تصور بھی قدیم سیاسی ایمپائر کے زمانہ میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

آج پریس کی طاقت کو استعمال کر کے وہ فورتھ اسٹیٹ (Fourth Estate) بنایا جاسکتا ہے جو اپنے آپ میں ایک متوازی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بڑی سے بڑی انٹر نیشنل کانفرنس کی جاسکتی ہے جس کا ہوائی جہاز کی ایجاد سے پہلے کوئی امکان ہی نہ تھا۔ آج نئے ذرائع کو استعمال کر کے ایسا عالی شان اسلامک سینٹر بنایا جاسکتا ہے جو قدیم طرز کے شاہی محل سے زیادہ پرعظمت ہو۔ آج انٹرنیٹ کی عالمی طاقت کو استعمال کر کے دنیا کے ہر گوشہ میں اسلام کا پیغام پہنچایا جاسکتا ہے جو قدیم زمانہ میں صرف ایک بعید خواب (distant dream) معلوم ہوتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

[redacted] [redacted]



شریعت اور تطبیقِ شریعت

انٹرنٹ پر راقم الحروف کے کچھ دعوتی مضامین کو دیکھنے کے بعد اس کے ایک قاری نے سخت رد عمل ظاہر کرتے ہوئے اپنا ایک ای میل بھیجا۔ اس میں انہوں نے ڈرامائی انداز میں میرے نقطۂ نظر کی تردید کی تھی۔ انہوں نے چند مثالیں دیتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ راقم الحروف کا نقطۂ نظر قرآن کے نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ انھوں نے لکھا تھا:

Maulana Wahiduddin says: Muslims should keep patience against atrocities committed for other nations and engage themselves in dawah work.

But in sharp contrast to it God Almighty says:
And fight them on until there is no more *fitnah*, and religion becomes Allah's in its entirety. (8:39)

پھر ہم کس کی بات مانیں۔ مولانا وحید الدین کی یا اللہ کی۔

بظاہر یہ بات بڑی سنسنی خیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقۃً وہ اتنی ہی زیادہ بے حقیقت ہے۔ اس غلطی کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر قرآن ایک مکمل مجموعہ کی شکل میں مکہ میں موجود ہوتا جیسا کہ آج وہ مذکورہ مکتوب نگار کے پاس برائے حوالہ موجود ہے تو عین ممکن ہے کہ ٹھیک یہی واقعہ قدیم مکہ میں پیش آتا جس کا ایک نمونہ انٹرنٹ کے مذکورہ مکتوب میں نظر آتا ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی دور میں جب وہاں کے مشرکین نے مسلمانوں کے اوپر سخت مظالم شروع کیے تو کچھ مسلمان اس سے متاثر ہو کر یہ کہتے کہ ہمیں ان مشرکین سے جنگ کی اجازت دیجئے اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ فرماتے کہ تم لوگ صبر کرو کیوں کہ مجھے صرف دعوت و تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے، مجھ کو جنگ کا حکم نہیں دیا گیا۔ اب اگر موجودہ مجلد قرآن کی طرح اس وقت مکمل قرآن موجود ہوتا تو شاید ایک شخص کھڑا ہو کر کہتا کہ "دیکھو، محمدؐ ہم سے صبر کرنے کے لئے کہتے ہیں، حالانکہ قرآن میں اللہ یہ کہتا ہے کہ ان سے جنگ کرو"۔

مگر قدیم مکہ میں ایسا حادثہ پیش نہیں آیا، اور اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ قدیم مکہ میں کسی کے پاس آج جیسا مکمل قرآن موجود ہی نہ تھا۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ مذکورہ قسم کا اعتراض کرتے ہیں ان کی اصل غلطی کیا ہے۔ ان کی اصل غلطی وہ ہے جس کو وضع الشئ فی غیر موضعہ کہا جاتا ہے۔ وہ قرآن کی آیت کو غلط مقام پر استعمال کر رہے ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ مسلمان دعوت کے مرحلہ میں ہیں اور انہیں صبر کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنی دعوتی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے، وہ ان آیتوں کو پیش کر رہے ہیں جو دفاع کے مرحلہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے اتاری گئیں۔ ایسے لوگ غلط انطباق (wrong application) کے مرتکب ہیں۔ وہ مکی حالات میں مدنی حالات والی آیتوں کے حوالے دے رہے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم مکہ میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کو وہ سارے مسائل اور مصائب پیش آرہے تھے جن کا ذکر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام نے ان مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم لوگ صبر کی روش اختیار کرو اور ٹکراؤ سے اعراض کرتے ہوئے دعوت کا کام جاری رکھو۔ پھر مکہ میں ایسا کیوں نہیں ہوا کہ مذکورہ مسلم مجاہد جیسا کوئی شخص کھڑا ہو کر یہ کہتا کہ دیکھو محمد ہم سے صبر کرنے کے لئے کہتے ہیں، حالانکہ قرآن میں اللہ صاف طور پر حکم دے رہا ہے کہ ان کافروں سے جنگ کرو۔

قدیم مکہ میں ایسا "حادثہ" پیش نہ آنے کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہاں موجودہ قسم کا مکمل قرآن مجلد صورت میں موجود ہی نہ تھا جو آج مذکورہ مسلم مجاہد کے ہاتھ میں ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن اس طرح بیک وقت ایک مجلد کتاب کی صورت میں نہیں اترا جس طرح آج وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ بلکہ قرآن مختلف اوقات میں جزءِ جزء کی صورت میں ۲۳ سال میں اتارا گیا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ حالات کی نسبت سے جس وقت جو حکم مطلوب ہوتا اس وقت وہ حکم قرآن میں اتار دیا جاتا۔ مثال کے طور پر ابتدائی مرحلہ میں صبر کرتے ہوئے

دعوت کا حکم (المدثر ۲۔۷) دیا گیا۔ اس کے بعد جب حالات کا تقاضا ہوا تو ہجرت کا حکم نازل ہوا (النحل ۴۱)۔ اس کے بعد جب حالات میں مزید تبدیلی ہوئی تو انہیں قتال کا حکم دیا گیا (البقرہ ۱۹۰)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جب قرآن اتر رہا تھا تو ترتیب نزول اور ترتیب واقعات دونوں میں یکسانیت تھی۔ اس بنا پر حکم اترتے ہی لوگوں کو فوراً معلوم ہو جاتا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ مگر بعد کو یہ ہوا کہ ۲۳ سال کے دوران مختلف اوقات میں اتری ہوئی آیتیں ایک واحد کتابی مجموعہ کی صورت میں لوگوں کو دے دی گئیں۔ بعد کی نسلوں کے سامنے یہی مجلد کتاب ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ حالات خود قانونِ فطرت کے مطابق ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں۔ جب کہ قرآن کی صورت میں ہمارے پاس جو خدائی گائیڈ بک ہے اس میں ہر قسم کے حالات کے لئے مختلف احکام بیک وقت ایک ہی مجلد کتاب میں اکھٹا ہیں۔ پھر بعد کے زمانے کے مسلمان اپنے معاملات میں اس مجموعۂ قرآن سے کس طرح رہنمائی حاصل کریں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا مطالعہ ان کے اسباب نزول کی روشنی میں کیا جائے۔ یعنی کسی وقت میں اپنی موجود حالت (given situation) کا بے لاگ تعین کیا جائے۔ اور دوسری طرف یہ معلوم کیا جائے کہ اُس سے مشابہ حالت (similar situation) جب دور اول میں پیش آئی تو اس وقت وہاں کون سی آیت نازل کی گئی۔ اور جب قرآن میں وہ آیت یا حکم مل جائے تو اس کو اپنے اوپر منطبق کیا جائے۔ گویا کہ جو مقصد دور اول میں مجرد نزول آیت کے ذریعہ حاصل ہوتا تھا وہ اب دونوں زمانوں کے حالات میں مشابہت (similarity) کے ذریعہ حاصل کیا جائے گا۔

سہولت فہم کی خاطر یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا زمانۂ نبوت وسیع تر نقشہ کے اعتبار سے، چار دوروں میں تقسیم ہے ـــــ (۱) مکی دور کا نصف اول (۲) مکی دور کا نصف ثانی (۳) مدنی دور کا نصف اول (۴) مدنی دور کا نصف ثانی۔ یہ چار دور جو پیغمبر اسلام کے زمانے

میں پیش آئے وہ چار فطری دور تھے۔ بنیادی طور پر یہی چار دور ہمیشہ انسانی تاریخ میں ظاہری فرق کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں۔ قرآن اور حقیقی حالات دونوں کا مطالعہ کرکے نہایت آسانی سے اس مشابہت (similarity) کو دریافت کیا جاسکتا ہے جو بعد کے زمانوں میں قرآن سے رہنمائی لینے کے لئے درکار ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، قرآن آج جس طرح ہمارے پاس ایک کامل مجموعہ کی صورت میں ہے اس طرح وہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے پاس موجود نہ تھا بلکہ اس وقت وہ جزء جزء کی صورت میں تھا۔ اس زمانہ میں قرآن کا کوئی ایک حصہ حسب موقع نازل ہوتا تھا، یعنی واقعی صورت حال کے لحاظ سے جو حکم مطلوب ہوتا وہی حصۂ قرآن اس وقت کے اہل ایمان کو دے دیا جاتا تھا۔ اس بنا پر قرآن کا متعلقہ حصہ اترتے ہی اہل ایمان کو معلوم ہو جاتا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور وہ فوراً اس مطلوب کام میں لگ جاتے تھے۔

مثال کے طور پر جس وقت حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ ساری توجہ دعوت و تبلیغ کے کام پر لگائی جائے، اس وقت یہ آیت اتری کہ **ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ** (النحل ۱۲۵) چنانچہ اس وقت کے پیروان رسول نے دعوت کو واحد نکاتی فارمولا (single point formula) کے طور پر اختیار کر لیا اور اس کام میں پوری طرح مشغول ہو گئے۔ اسی طرح جب صبر و تحمل کا موقع تھا تو یہ آیت اتری **فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل** (الاحقاف ۳۵) اس کے بعد اس وقت کے اہل ایمان نے پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ صبر کی روش کو اختیار کر لیا۔ اسی طرح جب فریق ثانی کی جارحیت کے نتیجہ میں دفاع کا مسئلہ سامنے آیا تو قرآن میں یہ آیت اتری: **قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم** (البقرۃ ۱۹۰) اس حکم کو پانے کے بعد اہل ایمان جنگ کے میدان میں سرگرم ہو گئے، وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ کے ۲۳ سالہ دور نبوت میں ایسا ہی ہوتا رہا۔ ہر بار قرآن کا وہی حصہ اترتا تھا جو موقع کے لحاظ سے بروقت مطلوب ہوتا تھا۔ اس لئے اس وقت کے اہل ایمان کے لئے اس

معاملہ میں صرف واحد معلوم حکم کی پیروی کا مسئلہ تھا نہ کہ یہ فیصلہ کرنے کا کہ مختلف اور متعدد احکام میں سے کون سا حکم بروقت ان سے مطلوب ہے اور کون سا حکم مطلوب نہیں۔

لیکن بعد کے زمانہ میں صورت حال بدل گئی۔ اب ایسا ہوا کہ مختلف اوقات میں اترے ہوئے قرآن کے حصے ایک کتابی مجموعہ کی صورت میں مجلد کر دئے گئے۔ گویا حکم اور حکم کا پس منظر (بیک گراؤنڈ) یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری خود مسلمانوں کی ہو گئی کہ وہ گہرے مطالعہ اور تدبر کے ذریعہ یہ جانیں کہ قرآن کا کون سا حکم کس معین وقت (given situation) میں ان پر قابل انطباق (applicable) ہے۔ اور اس طرح مطلوب قرآنی آیت کو دریافت کر کے اس پر یکسوئی کے ساتھ عمل شروع کر دیں۔

مزید غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ابتدائی دور کے اہل ایمان کی اصل ذمہ داری وہ تھی جس کو قرآن میں استماع (الاعراف ۲۰۴) کہا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا جو حصہ اتارا جائے اس کو پوری توجہ کے ساتھ سننا اور اس کی پیروی میں مصروف ہو جانا۔ اس کے مقابلہ میں بعد کے مسلمانوں کی مزید ذمہ داری وہ قرار پائی جس کو قرآن میں استنباط (النساء ۸۳) کہا گیا ہے۔ یعنی دیانت اور تقویٰ کے ساتھ غور و فکر کر کے خود یہ معلوم کرنا کہ وہ بروقت جس صورت حال میں ہیں اس کی نسبت سے وہ کس حکم الٰہی کے مخاطب ہیں، اور پھر اس پر یکسوئی کے ساتھ عمل شروع کر دینا۔

گویا کہ پہلے یہ تھا کہ دعوت کے وقت دعوت کا حکم اترتا تھا۔ صبر کے وقت صبر کا حکم اور جنگ کے وقت جنگ کا حکم نازل ہوتا تھا۔ اس بنا پر لوگوں کو حکم اور اس کا انطباق سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا تھا۔ بعد کے مسلمانوں کے لئے یہ ہوا کہ ایک ہی وقت میں دعوت اور صبر اور جنگ سب کا حکم انہیں ایک ساتھ دے دیا گیا۔ اب یہ خود مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری قرار پائی کہ وہ بطور خود یہ معلوم کریں کہ ان مختلف احکام میں سے کون سا حکم بروقت ان سے متعلق ہے۔ گویا کہ پہلے صورت حال بھی ایک تھی اور حکم بھی ایک۔ اور اب اس کے برعکس یہ ہو گیا کہ احکام مختلف

اور متعدد ہیں اور صورت حال کسی وقتِ خاص میں عملاً بدستور ایک ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، موجودہ قرآن نزولی ترتیب پر نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جس ترتیب سے قرآن کی آیتیں اتریں اسی ترتیب سے وہ مصحف میں جمع کردی گئیں۔

یہ غیر نزولی ترتیب غالباً مصلحت امتحان کی بنا پر ہے۔ وہ امتحان یہ ہے کہ مسلمان اپنی بے آمیز عقل کو استعمال کر کے یہ دریافت کریں کہ مختلف احکام میں سے وہ کون سا حکم ہے جو بر وقت ان سے مطلوب ہے۔ یہ امتحان اپنی نوعیت کے اعتبار ے ویسا ہی ایک امتحان ہے جس میں دور اول کے مسلمان مبتلاء کئے گئے تھے۔ دور اول کے مسلمانوں کا امتحان یہ تھا کہ وہ مختلف مدعیان ہدایت میں سے اس ہادی کو دریافت کریں جو اللہ کے نزدیک ہادی بر حق ہے۔ اسی طرح بعد کے مسلمانوں کے لئے یہ امتحان ہے کہ وہ مختلف اور متنوع احکام میں سے اس حکم کو دریافت کریں جو کسی وقت خاص میں اللہ کے نزدیک ان سے مطلوب ہے ـــــ پیغمبر کا ظہور اس کے ہم عصر لوگوں کے لئے معرفت ہادی کا امتحان تھا۔ قرآن کی غیر نزولی ترتیب بعد کے لوگوں کے لئے معرفت ہدایت کا امتحان ہے۔ بعد کے لوگوں کو اس امتحان میں اسی طرح پورا اترنا ہے جس طرح دور اول کے اہل ایمان اسی نوعیت کے امتحان میں ڈالے گئے اور کامیاب ہوئے۔

پیغمبر اور اس وقت کے اہل ایمان اسلام کے ابتدائی دور میں ۱۳ سال تک مکہ میں رہے۔ اس وقت وہاں مشرکین کے سردار غالب حیثیت میں تھے۔ وہ پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کو ستاتے تھے اور ان کے اوپر ظلم کرتے تھے۔ اب یہ سوال تھا کہ ان حالات میں اہل اسلام کیا کریں۔ اس وقت انھیں یہ رہنمائی دی گئی کہ: ولنصبرن علی ما آذیتمونا (ابراہیم ۱۲) یعنی ظلم وزیادتی کے باوجود صبر کے طریقہ پر قائم رہو۔

اس طرح بر وقت ہدایت کے مطابق اہل اسلام کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا ہے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ خواہ فریق ثانی کی طرف سے ظلم کیا جارہا ہو مگر انہیں یک طرفہ طور پر صبر کی روش پر قائم رہنا ہے۔

اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ پیغمبر اور آپ کے ساتھی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ چنانچہ نئے حالات میں حکم بھی بدل گیا۔ اس سے پہلے جس ظلم پر صبر کی ہدایت دی گئی تھی اس ظلم کے بارے میں اب یہ ہدایت دی گئی کہ ایسے ظالموں کے خلاف قتال کرو: أذن للذين يُقتلو ن بانهم ظلموا (الحج ۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ کبھی ظلم کے مقابلہ میں دفاع مطلوب ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ مطلوب ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہ کرتے ہوئے صرف صبر کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ کس صورت حال میں صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کرنا ہے اور وہ کون سی صورت حال ہے جب دفاعی قتال جائز ہو جاتا ہے۔

دور اول کے اہل اسلام کو اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا تھا۔ کیوں کہ عملاً جو صورت حال ہوتی تھی اسی کے مطابق جواب آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ اس طرح سوال اور جواب دونوں بیک وقت اپنے آپ معلوم ہوتے رہتے تھے۔ مگر بعد کے مسلمانوں کے لئے یہ صورت حال باقی نہیں رہی۔ بعد کے زمانہ کا معاملہ یہ ہے کہ حالات کی نسبت سے سوال تو موجود ہے مگر اس کا جواب مسلمانوں کو خود تلاش کرنا ہے۔

یہی بعد کے زمانہ کے اہل اسلام کا امتحان ہے۔ دور اول کے اہل اسلام کا امتحان اگر رسول کو پہچاننا تھا تو بعد کے لوگوں کا امتحان حکم رسول کو پہچاننا ہے۔ اب قرآن میں مذکورہ دونوں قسم کی آیتیں ایک ساتھ موجود ہیں۔ اب خود اہل اسلام کی یہ اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ بے آمیز غور و فکر کے ذریعہ یہ جانیں کہ کسی وقت خاص (given situation) میں کون سا حکم ان کو اپنے اوپر چسپاں کرنا ہے، اور کس حکم کو اس وقت خاص میں اپنے لئے گویا عملاً موقوف سمجھنا ہے۔ حکم کی اس نوعیت کا تعین پہلے وحی کے ذریعہ براہ راست ہوتا تھا اور اب یہ تعین ہمیں ذاتی اجتہاد کے ذریعہ کرنا ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ پیغمبر اور آپ کے ساتھی جب مکہ میں تھے اس وقت بھی مشرکین

وہاں موجود تھے اور ہجرت کے بعد بھی فتح مکہ تک مشرکین وہاں موجود رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے دور میں مکہ کے مشرکین کے بارے میں جو حکم دیا گیا وہ صرف یہ تھا کہ پرامن طریقِ کار کو اختیار کرتے ہوئے انہیں نظریہ توحید سے آگاہ کرو (قم فأنذر، اُدع الی سبیل ربك بالحکمة) اس ہدایت کے مطابق پیغمبر اور آپ کے ساتھی مکہ میں لوگوں کے پاس جاتے اور ان کو قرآن کی نازل شدہ دعوتی آیتیں سناتے۔ ان کے مجامع کو خطاب کرتے ہوئے کہتے: ایها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا (اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے)

مگر ہجرت اور فتح مکہ کے بعد صورت حال بدل گئی اب انہیں مشرکین کے بارے میں قرآن کی سورہ براۃ اتری جس میں ان کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا کہ: براءة من الله ورسوله الی الذین عاهدتم من المشرکین (اعلان برأت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا) التوبہ ا۔

اس سورہ کے نزول کے بعد جو پہلا حج آیا اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے ایک وفد کو مکہ بھیجا۔ ان لوگوں نے وہاں جا کر مشرکین کے درمیان یہ اعلان کیا کہ: ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسوله (تفسیر ابن کثیر ۲/۳۳۳) یعنی اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بری ہیں۔ کوئی عہد یا ذمہ داری اب مشرکین کے حق میں موجود نہیں۔

اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے مشرکین کے مقابلہ میں جب دعوت و تبلیغ مطلوب تھی، اس وقت قرآن میں دعوت و تبلیغ کی آیتیں اتریں۔ اور جب ان کے مقابلہ میں برأت مطلوب ہو گئی تو اس وقت برأت والی آیتیں قرآن میں نازل ہوئیں۔ اس طرح حسبِ موقع خود آیات کے نزول کی ترتیب ہی اس بات کو جاننے کے لئے کافی ہو گئی کہ کس وقت انہیں کیا کرنا ہے اور کس وقت کیا نہیں کرنا ہے۔

بعد کے مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اب یہ صورت حال ہے کہ پورا قرآن بیک وقت مجلد صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں دونوں قسم کی آیتیں ایک ساتھ پائی

جاتی ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کو خود اپنے ذاتی اجتہاد سے یہ جاننا ہے کہ کس وقت خاص میں وہ اپنے آپ کو ایک آیت کا مخاطب سمجھیں۔ اور کس وقت خاص میں وہ یہ جانیں کہ اب وہ دوسری آیت کے مخاطب ہوگئے ہیں۔

یہی بعد کے زمانہ کے لوگوں کا امتحان ہے۔ دور اول کے لوگوں کا امتحان میں کامیاب ہونا یہ تھا کہ وہ رسول برحق کو پہچانیں اور اس کو اپنا رہنما بنالیں۔ اور ان کا امتحان میں ناکام ہونا یہ تھا کہ وہ رسول کو پہچاننے میں عاجز ثابت ہوں اور اس بنا پر اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔

بعد کے زمانہ کے لوگ بھی امتحان کے اسی میدان میں کھڑے ہوئے ہیں اس فرق کے ساتھ کہ اب پچھلے لوگوں کو ذاتِ رسول کو پہچاننا تھا اور آج کے لوگوں کو حکم رسول کو پہچاننا ہے۔ بعد کے زمانہ کے مسلمانوں کی کامیابی یہ ہے کہ وہ قرآن کے مختلف احکام میں سے اس حکم کو دریافت کریں جو ان کے حالات کے لحاظ سے ان سے مطلوب ہے۔ اور ان کا ناکام ہونا یہ ہے کہ وہ اپنے حق میں مطلوب حکم کو دریافت نہ کر سکیں۔ مثلاً اگر ان کے واقعی حالات کے لحاظ سے صبر و دعوت کی آیتیں ان پر منطبق ہوتی ہیں، ایسی حالت میں اگر وہ قرآن سے قتال کی آیتوں کو لے کر دوسری قوموں سے لڑنا شروع کردیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے امتحان میں ناکام ہوگئے۔

یہ ناکامی بے حد سنگین ہے، یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسی ہی ناکامی ہے جیسے عہد رسالت میں آپ کا کوئی معاصر شخص آپ کے رسولِ خدا ہونے کو پہچاننے میں ناکام رہ جائے۔ اس پہچان کی کامیابی بھی بہت بڑی ہے اور اس کو نہ پہچاننے کی محرومی بھی بہت بڑی۔

ہدایت وضلالت کا راز

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: یضلُّ به کثیراً و یهدی به کثیراً (البقرہ ۲۶) یعنی اللہ اس کے ذریعہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس سے راہ دکھاتا ہے۔ قرآن بلاشبہہ ایک برحق کلام ہے۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ قرآن کی باتوں سے کسی کو گمراہی ملتی ہے اور کوئی اس کو پڑھ کر ہدایت حاصل کرلیتا ہے۔ اس فرق کا خاص سبب ریفرنس کا فرق ہے۔ قرآن کو اگر اس کے صحیح

ریفرنس میں پڑھا جائے تو پڑھنے والے کو اس سے ہدایت ملے گی۔ اس کے برعکس اگر ریفرنس کو بدل دیا جائے تو وہی کلام آدمی کے لئے گمراہی کا سبب بن جائے گا۔

قرآن کو اس کے صحیح ریفرنس میں پڑھنے کی صورت یہ ہے کہ اس کو اسباب نزول کی روایتوں کی روشنی میں پڑھا جائے۔ حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں کثرت سے وہ روایتیں آئی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ قرآن کی کونسی آیت کس خاص موقع پر اتاری گئی۔ اسباب نزول کی یہ روایات نہ صرف قرآن کے ابتدائی مفہوم کو سمجھنے میں مددگار ہیں بلکہ بعد کے زمانہ میں بھی اس کے صحیح انطباق (application) کو جاننے کے لئے وہ معتبر رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسباب نزول کی روایات کی روشنی میں قرآن کے مطالعہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن ایک زمانی کتاب ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکم کی ابتدائی نوعیت کو سمجھا جائے تاکہ اس حکم کا وسیع تر انطباق دریافت کیا جاسکے۔

قرآن میں اکثر احکام اجمالی انداز میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچادو، پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے (الحجرات ٦) اسباب نزول کی روایات کے مطابق، یہ آیت ایک مخصوص واقعہ پیش آنے پر اتری۔ مگر خود آیت میں نہ اس واقعہ کا ذکر ہے اور نہ اس واقعہ سے متعلق افراد کا نام۔ ایسی حالت میں اس آیت کا اصل مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اس واقعہ کی روشنی میں پڑھا جائے جس کے پیش آنے پر یہ آیت اتری۔

اس طرح مذکورہ واقعہ ہمیں اس پس منظر (background) کا علم دیتا ہے جس کی روشنی میں ہم اس آیت میں وارد شدہ حکم کی اصل نوعیت کو سمجھ سکیں۔ اور جب حکم کی ابتدائی نوعیت کو درست طور پر سمجھ لیا جائے تو بعد کے زمانہ میں اس کا انطباق (application) بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قسم کی صورت حال میں قرآن کیا حکم دیتا ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن جس طرح ہدایت کا سرچشمہ ہے اسی طرح کچھ لوگوں کو اس سے گمراہی ملتی ہے۔ یہ گمراہ ہونے والے کون لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کا مطالعہ غلط ریفرنس میں کریں۔ غلط ریفرنس یہ ہے کہ آدمی قرآن کی آیتوں کو اسباب نزول کی روشنی میں نہ پڑھ کر ان کو خود اپنی خواہشات اور مزعومات کی روشنی میں پڑھنے لگے۔

آزادانہ سوچ کے تحت ایک آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنے دشمن کو ہلاک کرو اور اس طرح اس کے مسئلہ کو حل کرو۔ لیکن اس معاملہ کو قرآنی آیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو برعکس طور پر یہ معلوم ہوگا کہ اسلام کا نشانہ مخالفین کو مارنا نہیں ہے بلکہ ان پر تبلیغ کر کے ان کو اسلام کے دائرہ میں داخل کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت واضح رہنما کی حیثیت رکھتی ہے:

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبے والا ہے۔ اور اگر شیطان تمہارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ مانگو بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ (حم السجدہ ۳۳۔۳۶)

قرآن کی آیتوں سے رہنمائی لینے کے لئے اسباب نزول کی روایتیں بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ قرآن کی آیتوں کو اگر اسباب نزول کے بغیر پڑھا جائے تو ہر آیت مطلق حکم دیتی ہوئی نظر آئے گی۔ لیکن جب ہم قرآن کو اسباب نزول کی روایتوں کی روشنی میں پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر آیت کے نزول کا ایک متعین پس منظر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جب بھی کوئی صورت حال پیدا ہوئی تو اس صورت حال کی نسبت سے خدا کا حکم قرآن میں اتار ا گیا۔

ایسی حالت میں یہ درست نہیں کہ قرآن کی آیتوں کو مطلق انداز میں لے لیا جائے اور مطلق انداز میں اس کا انطباق کیا جائے۔ اس کے برعکس ضروری ہے کہ اسباب نزول کی روشنی

میں آیتوں کا مطالعہ کیا جائے۔ تاکہ اس کے نزول کا پس منظر معلوم ہو اور پھر جب بھی اس کے مشابہ صورت حال (similar situation) پیدا ہو تو اس آیت کے حکم کو وہاں منطبق کیا جائے۔ اس اصول کے مطابق، قرآن کی آیتوں کو اس کے صحیح ریفرنس میں لینا ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اور ان کو غلط ریفرنس میں لینا گمراہی کا ذریعہ۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مختلف اور متنوع قسم کے احکام کا مجموعہ ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ایک جگہ یہ حکم ملے گا کہ مشرکین سے اعراض کرو (الحجر ۹۴)۔ دوسری جگہ قرآن میں یہ حکم ہو گا کہ مشرکین سے قتال کرو۔ (التوبہ ۳۶) یہ دونوں حکم بظاہر ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آج کا ایک قاری ان پر کس طرح عمل کرے۔

اسباب نزول کی روایات اس کا جواب ہیں۔ قرآن میں جتنے بھی احکام ہیں وہ مخصوص مواقع پر اترے ہیں۔ اسباب نزول کی یہ روایتیں بتاتی ہیں کہ کون سا حکم کس موقع پر اترا اور کون سا حکم کس موقع پر۔ اس طرح اسباب نزول کی روایتوں کے مطالعہ سے ہم قرآنی احکام کا انطباقِ اول (first application) دریافت کر سکتے ہیں۔ اور جب ایک حکم کا انطباقِ اول معلوم ہو جائے تو اس کے انطباقِ ثانی (second application) کا جاننا اپنے آپ آسان ہو جاتا ہے۔

اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ جب بھی ہم کسی صورت حال میں مبتلا ہوں اور ہمیں اس کے لئے حکم قرآنی کو جاننا ہو تو ہم اسباب نزول کی روایتوں کا مطالعہ کر کے یہ دریافت کریں کہ اس قسم کی صورت حال جب صحابہ کو لاحق ہوئی تو اس وقت ان کے اوپر قرآن کا کون سا حکم اترا۔ اس طرح دونوں حالتوں کے درمیان مشابہت (similarity) وہ چیز ہے جو ہمیں یہ رہنمائی دیتی ہے کہ کس صورت حال میں ہم قرآن کی کس آیت کا اپنے آپ کو مخاطب سمجھیں۔ یعنی انطباق اول کی روشنی میں انطباق ثانی کا تعین کریں۔

اسلام بلاشبہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ مگر اس کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ سیاسی طاقت حاصل کر کے اس کو ایک نظام کی حیثیت سے لوگوں کے اوپر نافذ کیا جائے۔

ایسا مکمل نفاذ عملاً صرف جزئی نفاذ کے ہم معنی ہو گا۔ کیوں کہ طاقت کے زور سے صرف کچھ خارجی احکام نافذ کئے جا سکتے ہیں۔ جب کہ اسلام کا بیشتر حصہ نیت یا داخلی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ داخلی کیفیت آدمی خود اپنے ارادہ سے اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ اوپر سے اس کا نفاذ کیا جانا ممکن نہیں۔

اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص یا کوئی جماعت جب بھی کسی صورت حال سے دوچار ہو تو وہ اس موقع کے لئے قرآن وسنت میں اپنے لئے ایک حکم پالے۔ مثلاً آدمی کو غصہ آئے تو وہاں اس کے لئے اسلام میں یہ رہنمائی موجود ہو گی کہ جس کے خلاف تمہیں غصہ آیا ہے اس کو تم معاف کردو۔ اسی طرح کوئی ایسا موقع پیش آئے جہاں آدمی کو گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہاں اسلام کے اس حکم میں اس کے لئے یہ رہنمائی ہو گی کہ تم عدل کے مطابق گواہی دو۔ اسی طرح کسی انسان کے خلاف بدگمانی کی بات علم میں آئے تو وہاں اسلام کا یہ حکم اس کی رہنمائی کر رہا ہو گا کہ تم کسی کے خلاف کوئی رائے اس وقت تک ہرگز قائم نہ کرو جب تک کہ اس کی مکمل تحقیق نہ کرلو۔ اسی طرح اگر کسی کو مال یا اقتدار حاصل ہو تو ایسی حالت میں اس کے لئے اسلام یہ رہنمائی دے رہا ہو گا کہ تم اپنے مال کو کس طرح خرچ کرو اور تم اپنے اقتدار کا استعمال کس طرح کرو، وغیرہ۔

خدا کا دین پورا کا پورا برائے امتحان ہے۔ اسلام کا ہر حکم ایک پرچۂ امتحان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی اس نوعیت کا تقاضا ہے کہ اسلام آدمی کے لئے ایک اختیارانہ پیروی کی حیثیت رکھتا ہو نہ کہ مجبورانہ تعمیلِ حکم کی حیثیت۔

تکمیل دین

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ارشاد ہوا ہے: تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو اور وہ جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ لگنے سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے اور وہ جس کو درندے نے کھایا ہو مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا اور وہ جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تم تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے۔ یہ گناہ کا کام ہے۔ آج کافر تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ پس جو بھوک سے مجبور ہو جائے لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (المائدہ ۳)

روایات کے مطابق یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں حجۃ الوداع کے موقع پر اتری۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اب دین اسلام کو اللہ نے کامل کر دیا۔ اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں۔ مثلاً یہ کہ اکمال دین یا تکمیل دین سے کیا مراد ہے۔ اور یہ کہ "فلا تخشوھم واخشونِ" کی تفسیر کیا ہے۔ اسی طرح یہ کہ "رضیت لکم الاسلام دینا" کا مطلب کیا ہے۔ ان سوالات کے بارے میں مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔

تکمیل استحکام نہ کہ تکمیل احکام

قرآن کی اس آیت میں اکمال دین یا تکمیل دین کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ نازل ہونے والے احکام دین کی فہرست آج مکمل ہو گئی۔ یہاں اکمال دین سے مراد استحکام دین ہے نہ کہ فہرست احکام کی تکمیل۔ یہی مفہوم لغت سے ثابت ہوتا ہے اور یہی مفہوم آیت کے سیاق وسباق سے بھی۔

سب سے پہلے لغت کو لیجئے۔ مشہور عربی لغات لسان العرب میں اس کی جو تشریح کی گئی

ہے وہ یہ ہے: قال الله تعالیٰ، اليوم اكملت لكم دينكم و اتممت عليكم نعمتي . معناه والله اعلم: الآن اكملت لكم دينكم بأن كفيتكم خوف عدوكم و اظهرتكم عليهم، كما تقول الآن كمل لنا الملك و كمل لنا ما نريد بان كفينا من كنا نخافه...... فأما أن يكون دين الله عزو جل في وقت من الأوقات غير كامل فلا (لسان العرب، مطبوعہ بیروت، ۱۱/۵۹۸)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اس کا مطلب یہ ہے، اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے، اب میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا، اس طرح کہ میں تمہارے دشمن سے خوف کے معاملہ میں تمہارے لئے کافی ہو گیا اور میں نے تم کو ان کے اوپر غالب کر دیا۔ جس طرح تم کہتے ہو کہ اب ہمارا اقتدار ہمارے لئے مکمل ہو گیا۔ اور ہمارے لئے وہ چیز کامل ہو گئی جس کو ہم چاہتے تھے، اس طرح کہ ہم ان پر کافی ہو گئے جن سے ہمیں خوف تھا۔ اور یہ کہ اللہ عزوجل کا دین کسی بھی وقت غیر کامل رہا ہو تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

تفسیر کی کتابوں میں عام طور پر کسی آیت کے تحت مختلف اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ قول بھی تفسیر کی کتابوں میں عام طور پر موجود ہے۔ یہاں چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

مفسر القرطبی نے لکھا ہے: و قيل "اكملت لكم دينكم" بأن اهلكت لكم عدوكم واظهرت دينكم على الدين كله كما تقول: قد تم لنا مانريد اذا كفيت عدوك (الجامع لاحکام القرآن ۶/۶۲) اور کہا گیا ہے کہ میں نے تمہارے لئے تمارے دین کو کامل کر دیا، یعنی میں نے تمہارے لئے تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیا اور میں نے تمہارے دین کو سارے دین پر غالب کر دیا۔ جیسا کہ تم کہتے ہو کہ جو ہم چاہتے تھے وہ ہمیں پورا ہو گیا۔ جب کہ تم اپنے دشمن پر کافی ہو جاؤ۔

مفسر النسفی نے سورہ المائدہ کی اس آیت کے تحت لکھا ہے: اليوم ظرف لقوله

اکملت لکم دینکم بأن کفیتم خوف عدوکم و اظهرتکم علیهم کما یقول الملوک الیوم کمل لنا الملک أی کفینا من کنا نخافه (تفسیر النسفی ۱/۲۷۰) یعنی اس آیت میں الیوم، اکملت لکم دینکم کا ظرف ہے۔ یہ کہ میں تمہارے دشمن کے خوف کے معاملہ میں تمہارے لئے کافی ہو گیا۔ اور میں نے تم کو ان کے اوپر غالب کر دیا، جس طرح بادشاہ کہتے ہیں کہ آج اقتدار ہمارے لئے مکمل ہو گیا یعنی ہم ان کے لئے کافی ہو گئے جن سے ہمیں خوف تھا۔

القاضی محمد ثناء اللہ العثمانی اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: وقیل اظهرت دینکم علی الادیان کلها و آمنتکم من الاعداء (التفسیر المظہری ۳/۲۵) یعنی کہا گیا ہے کہ میں نے تمہارے دین کو دوسرے تمام دینوں پر غالب کر دیا اور تم کو دشمنوں سے مامون کر دیا۔

اس تفسیر کے حق میں ایک داخلی شہادت یہ ہے کہ اس آیت میں تکمیل دین کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ اب تمہارے لئے خشیت انسانی کا مسئلہ نہیں، اب تمہارے لئے صرف خشیت الٰہی کا مسئلہ ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ فہرست احکام کی تکمیل کا کوئی بھی تعلق خوف و خشیت کے مسئلہ سے نہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تکمیل کی اس آیت کے نزول کے بعد بھی مسلسل اہل اسلام کے لئے انسانوں کی طرف سے خوف و خشیت کے مسائل پیدا کئے جاتے رہے۔ اور قانون فطرت کے تحت ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب میں مدینہ کی اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کا پھیل جانا، خلیفہ دوم اور خلیفۂ سوم اور خلیفۂ چہارم کو قتل کیا جانا، کعبہ کا ڈھایا جانا اور عبد اللہ بن زبیر و امام حسین کا قتل کیا جانا، وغیرہ وغیرہ۔

تکمیل کو تکمیل فہرست کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس پر ایک سنگین شبہہ وارد ہوتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اسلام سے پہلے جو انبیاء آئے ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ کر تمام پیغمبروں پر صرف اساسی دین اترا تھا۔ پھر کیا نعوذ باللہ یہ تمام پیغمبر ناقص دین کے ساتھ دنیا میں آئے اور ناقص دین ہی پر ان کی وفات ہو گئی۔

سورہ المائدہ کی آیت کے نزول سے قبل یا تو طبعی طور پر وفات پاگئے یا جنگ میں شہید ہوگئے۔ ان اصحاب رسول نے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ انہوں نے ہر قسم کا ظلم برداشت کرتے ہوئے پیغمبر اسلام کا ساتھ دیا۔ پھر کیا نعوذ باللہ وہ ناقص دین پر جئے اور ناقص دین پر وفات پاگئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماننا گمراہی کی حد تک غلط ہوگا۔ اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں تکمیل سے تکمیل فہرست نہ مانی جائے بلکہ اس کی تشریح قیام واستحکام کی اصطلاحوں میں کی جائے۔

واقعات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ۱۰ھ میں جب یہ آیت اتری اس وقت تمام احکام نازل ہو چکے تھے۔ مصدقہ روایات بتاتی ہیں کہ قرآن کے کئی احکام سورۂ مائدہ کی اس آیت کے بعد اترے۔ مثال کے طور پر ربا کا حکم اور کلالہ کا حکم، وغیرہ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۶/۶۲) ایسی حالت میں اس آیت میں تکمیل دین سے فہرست احکام کی تکمیل کو مراد لینا ممکن نہیں۔

قرآن کی آیتوں کے نزول میں جو ترتیب پائی جاتی ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ نزول آیات کا یہ معاملہ ابتدائی نقطۂ سے شروع ہوکر تکمیل کے نقطۂ تک پہنچا۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ احکام کی مطلوبیت ہمیشہ واقعی حالات کی نسبت سے ہوتی ہے۔ یعنی جیسے حالات ویسا حکم۔ اسلام کے مکی دور میں دعوتی حالات تھے اس لئے وہاں زیادہ تر توحید کی آیتیں اتریں جو کہ دین کی اصل اور اساس ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کا ایک معاشرہ بن گیا تو وہاں قانونی اور معاشرتی احکام بھی نازل کردیئے گئے۔

نزول آیات کی یہ ترتیب ہمیشہ کے لئے مطلوبیت کی ترتیب ہے۔ اہل اسلام کو ہر دور میں یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے حقیقی حالات کا بے لاگ جائزہ لیں، اور پھر اس کی نسبت سے یہ متعین کریں کہ حالات کے مطابق قرآن کے کن احکام پر انہیں عمل کرنا ہے۔

سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں روایت آئی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے (اپنے زمانۂ خلافت میں) کہا کہ قرآن میں سب سے آخری آیت جو اتری وہ ربا کی آیت تھی اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور آپ نے اس کی تفسیر نہیں کی۔ پس تم لوگ ربا کو بھی چھوڑ دو اور جس میں ربا کا شبہہ ہو اس کو بھی چھوڑ دو۔ (قال عمر رضی الله عنه ان آخر مانزل من القرآن آیة الربا و إن رسول الله صلی الله علیه وسلم قبض و لم یفسرها فدعوا الربا والریبة) مسند احمد ۱/۳۶

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ بجائے خود درست نہیں کہ قرآن تمام احکام دین کا مکمل مجموعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اصلاً اساسات دین کی کتاب ہے۔ اس میں دین کے تمام بنیادی مسائل مکمل طور پر بیان کر دئے گئے ہیں۔ جہاں تک تفسیری احکام کا تعلق ہے، ان کی مکمل فہرست پیش کرنا قرآن کا موضوع ہی نہیں۔ یہ کام علماء اسلام کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کی اساسی ہدایات کی روشنی میں قیاس اور استنباط کے ذریعہ انہیں مرتب کریں، اسی بنا پر فقہاء اسلام نے قرآن میں قیاس اور استنباط کے ذریعہ ہزاروں احکام وضع کئے۔ مزید یہ کہ قیاس و استنباط کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا بلکہ وہ قیامت تک جاری رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ سورہ المائدہ کی مذکورہ آیت میں تکمیل دین سے مراد استحکام دین ہے۔ آیت میں جس الیوم (آج) کا ذکر ہے اس دن استحکام کی تکمیل ہوئی تھی نہ کہ نزول احکام کی تکمیل۔ مکہ میں جب اسلام کا آغاز ہوا اسی وقت اللہ نے اپنا کامل دین اتار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کامل دین کی طرف لوگوں کو بلا رہے تھے۔ یہ کامل دین کیا ہے، یہ توحید ہے۔ توحید ہی تمام انبیاء کے دین کی اصل ہے۔ بقیہ جو چیزیں ہیں وہ اسی اصل کے فروع یا تقاضے ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ جس آدمی نے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا وہ جنت میں داخل ہو گیا (من قال لاإله الا الله دخل الجنة) اسی طرح آپ نے فرمایا کہ کہو اللہ میرا رب ہے اور اس پر جم جاؤ (قل ربی الله ثم استقم)

توحید کوئی سادہ بات نہیں، وہ ہر اعتبار سے ایک مکمل عقیدہ ہے اس کا تعلق انسان کی پوری شخصیت سے ہے۔ جب ایک آدمی کو توحید کی حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے تو عین اسی

وقت اس کو مکمل دین مل جاتا ہے۔ توحید کی صورت میں وہ سب کچھ پالیتا ہے۔ اس لئے قرآن میں سب سے زیادہ توحید پر زور دیا گیا ہے۔ بلکہ قرآن کی تمام آیتیں براہِ راست یا بالوسطہ طور پر توحید ہی کا بیان ہیں۔ ایک امریکی اسکالر جس نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسلام پر ایک کتاب تیار کی ہے، اس نے اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

The greatest concern of Islam is Allah.

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب مکہ میں اسلامی دعوت کا کام شروع کیا اور لوگوں سے کہا کہ ایھا الناس قولوا لاالہ الا اللہ تفلحوا۔ تو یہ "ناقص دین" کی دعوت نہ تھی بلکہ وہ پورے معنوں میں کامل دین کی دعوت تھی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس دور میں مکہ کے جو لوگ ایمان لائے وہ اسلام کی تاریخ ساز شخصیت تھیں مثلاً ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان بن عفان اور علی بن ابی طالب وغیرہ۔ ان لوگوں کا ایمان و اسلام مکی دور ہی میں مکمل تھا، ایسا نہیں کہ وہ بعد کو مکمل ہوا جب کہ تمام آیتیں نازل ہو گئیں۔

اصل یہ ہے کہ نظریۂ توحید کی حقیقت اسلام میں بیج کی مانند ہے۔ بیج جب زمین میں جگہ پکڑ لے تو اس کے بعد وہ اپنے آپ میں کامل درخت کے ہم معنٰی بن جاتا ہے۔ اسی طرح جس انسان کو توحید کی حقیقت حاصل ہو جائے وہ اسی کے ساتھ مکمل مومن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک ہے شخصیت مومن، اور دوسری چیز ہے خارجی احوال۔ مومن کی شخصیت اسی دن مکمل ہو جاتی ہے جب کہ اسے اللہ کی کامل معرفت حاصل ہو جائے۔ البتہ خارجی احوال کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ خارجی احوال میں تکمیل یا استحکام اس وقت متحقق ہوتا ہے جب کہ اہل اسلام کو اپنے ماحول میں عملاً غالب حیثیت حاصل ہو جائے، یہی واقعہ مذکورہ آیت کے نزول کے وقت عرب میں آیا۔

تفسیری فرق کے نتائج

مذکورہ تفسیری فرق کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، یہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ اس کے

نتیجہ میں آدمی کے فکر و عمل پر نہایت دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

جو لوگ مذکورہ آیت کی تفسیر اس طرح کریں کہ اس میں فہرست احکام کی تکمیل کا اعلان کیا گیا ہے وہ اس کا مطلب یہ سمجھ لیں گے کہ اسلام ایک مکمل قانونی نظام ہے اور کسی مکمل قانونی نظام کو زمین پر قائم کرنے کے لئے سیاسی اقتدار ضروری ہے۔ اس سیاسی ذہن کے تحت وہ اس آیت کا تقاضہ یہ سمجھ لیں گے کہ وقت کے حکمرانوں سے ٹکراؤ کر کے "اقتدار کی کنجیاں" ان سے چھین لیں اور پھر حکومت کے زور پر اس مکمل قانونی نظام کو زمین پر نافذ کریں۔

یہ تفسیر عین اپنی فطرت کی بنا پر وہی نتیجہ پیدا کرے گی جو کمیونزم کے نظریہ نے پیدا کیا۔ یعنی اس تفسیر کو ماننے والے ہر جگہ وقت کے حکمرانوں سے بے فائدہ لڑائی چھیڑ دیں گے جس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ اسلام عملاً نفرت اور تشدد اور تخریب کاری کا مذہب بن جائے گا، جیسا کہ اسی تفسیر کی بنا پر موجودہ زمانہ میں دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے برعکس آیت کی صحیح تفسیر سامنے ہو تو لوگوں کے اندر دعوتی ذہن پیدا ہوگا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے آج کی دنیا میں ہمارے لئے انتہائی اعلیٰ قسم کے دعوتی مواقع پیدا کر دئے ہیں۔ ان جدید مواقع کو استعمال کر کے ہم اسلام کے پیغام کو سارے انسانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس طرح ہم ساری دنیا کو اسلام کے سایۂ رحمت میں لانے کا عظیم کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔

سورۃ المائدہ (آیت ۳) میں اسلام کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، وہ چار چیزوں پر مشتمل ہیں ـــــ (۱) منکرین حق کا مایوس ہو جانا (۲) اکمال دین (۳) اتمام نعمت (۴) اسلام کا پسندیدہ دین بن جانا۔ اب ان چاروں پہلوؤں کے بارے میں مختصراً غور کیجئے۔

۱۔ منکرین حق کے مایوس ہو جانے کا مطلب کیا ہے۔

ساری دنیا میں الناس علی دین ملوکھم کا اصول رائج تھا۔ کسی ملک کے عوام کا مذہب وہی ہوتا تھا جو ان کے حکمراں کا مذہب ہوتا تھا۔ لوگوں کو ریاستی مذہب (state religion) کے سوا کسی اور مذہب کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب کوئی شخص یا گروہ ریاستی مذہب کے

سوا کوئی اور مذہب اختیار کرنا چاہتا تو اس کا یہ فعل ریاست سے بغاوت کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو وہی سزا دی جاتی تھی جو باغیوں کے لئے مقرر تھی۔ یہی تصور ہے جس نے قدیم زمانہ میں مذہبی ایذارسانی (religious persecution) کا سنگین مسئلہ پیدا کیا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ فتنہ کا خاتمہ کردیں۔ اولاً پرامن کوشش کے ذریعہ۔ اور گر فریق ثانی جارحیت پر اتر آئے تو وہ لڑ کر اس کو مٹا دیں (البقرہ ۱۹۳)۔ اس کے مطابق پیغمبر اور آپ کے اصحاب نے ایک عظیم جدو جہد شروع کی۔ تاہم اس قسم کا ہزاروں سال سے رائج شدہ نظام کبھی فوری طور پر ختم نہیں ہوتا۔ وہ نسل در نسل کی کوششوں کے بعد ختم ہوتا ہے۔ پیغمبر اور آپ کے اصحاب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ اس کے تسلسل کو توڑ دیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ فتنہ کے خلاف یہ تحریک ایک عمل کے طور پر تاریخ انسانی میں شامل ہوگئی۔ یہ عمل مختلف صورتوں میں برابر جاری رہا یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں وہ اپنی آخری تکمیل کو پہنچ گیا۔

اب ساری دنیا میں مذہبی آزادی کا زمانہ آچکا ہے۔ آج عالمی طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ہر انسان ناقابل تنسیخ طور پر یہ حق رکھتا ہے کہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے مذہب پر عمل کرے۔ قرآن کے مذکورہ الفاظ گویا یہ بتا رہے ہیں کہ اب تاریخ کی تشکیل جس انداز پر ہونے والی ہے اس میں مذہبی جبر کا امکان ہی سرے سے ختم ہو جائے گا۔ کسی بھی شخص یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ اہل توحید پر ان کے دین کے سلسلہ میں کوئی رکاوٹ ڈالے ـــــ یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا کہ منکرین حق اب تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے۔ اب تم انسانی خوف سے مامون ہو کر اللہ کے دین کی پیروی کرسکتے ہو۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسری چیز اکمال دین یا تکمیل دین ہے۔ یہ الفاظ بھی محض وقتی الفاظ نہیں ہیں وہ اس پوری تاریخ کی نوعیت کو بتاتے ہیں جو اسلامی انقلاب کے بعد دنیا میں بننے والی تھی۔ اور آج جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں یہ تاریخی عمل پورا ہو کر اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔

اس استحکام دین کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اسلام کی مسلسل اشاعت کے نتیجہ میں ساری دنیا میں ایک بلین سے زیادہ مسلمانوں کا پایا جانا، دنیا کے ہر گوشہ میں اسلامی اداروں کا قائم ہونا، دنیا بھر میں تقریباً ۶۰ مسلم حکومتوں کا وجود میں آنا، حج کی عبادت کے احیاء کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر عالمی اتحاد کا پیدا ہونا۔

اس فہرست میں وہ نئے موافق اسباب بھی شامل ہیں جو صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں وسیع پیمانہ پر پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً پٹرول اور دوسرے ذرائع کے حصول کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر مضبوط معاشی بنیاد کا وجود میں آنا۔ جدید کمیونی کیشن کے نتیجہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں میں اتحادی فضا کا فروغ پانا۔ پرنٹنگ پریس کے ذریعہ اسلام کا اشاعتی استحکام وغیرہ۔

اس قسم کی مختلف چیزوں نے اب خدا کے دین کو اتنا زیادہ مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی بھی دشمن یا مخالف خدا کے دین کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

۳۔ اب اتمام نعمت کو لیجئے۔ نعمت کا مکمل ہونا کیا ہے۔ یہ دراصل تحریک رسالت کا مکمل ہونا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان جب زمین پر آباد ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کے لئے اپنے پیغمبر بھیجنے شروع کئے۔ ایک روایت کے مطابق مجموعی طور پر ایک لاکھ سے زیادہ پیغمبر دنیا میں آئے۔ مگر پچھلے تمام پیغمبروں کا حال کم وبیش یہ رہا کہ ان کی دعوت صرف فکری مرحلہ تک پہنچی وہ عملی انقلاب کے مرحلہ میں داخل نہ ہو سکی۔

جب بھی کوئی پیغمبر اللہ کی طرف سے دین کا پیغام لے کر آیا تو وقت کے سردار اس کے مخالف بن جاتے۔ وہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کو دبا دینے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں صرف یہ ہوا کہ انہوں نے حق کا اعلان کیا اور لوگوں کو اس سے باخبر کرنے کے لئے اپنی ساری کوششیں کیں۔ مگر ان کی پشت پر ایسی طاقتور جماعت نہ بن سکی جو اللہ کے دین کو فکری دور سے آگے بڑھ کر عملی انقلاب کے دور میں پہنچا دے۔ اس غیر مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے پیغمبروں کا اندراج ان کی ہمعصر تاریخوں میں نہ ہو سکا۔ خالص تاریخی اعتبار سے، پچھلے تمام پیغمبر،

بشمول حضرت مسیح غیر تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

خدا کے دین کی تاریخ میں یہ تبدیلی اہل ایمان کے حق میں ایک عظیم نعمت ہے۔ پچھلے زمانوں میں کوئی شخص صرف انفرادی ماحول میں رہنے پر مجبور تھا۔ اب وہ دور آگیا ہے کہ خدا کا دین انسانی تاریخ میں ایک عمومی فکر کے طور پر شامل ہو چکا ہے۔ یہ صورت حال مختلف پہلوؤں سے اہل ایمان کے لئے ایک عظیم نعمت ہے، ایک ایسی نعمت جو پچھلی امتوں کے زمانہ میں حاصل نہ ہو سکی تھی۔

۴ اللہ کے نزدیک اسلام کو اس کے پسندیدہ دین کی حیثیت حاصل ہو گئی، اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے دین سے اللہ راضی نہ تھا اور اب وہ اسلام سے راضی ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اللہ کا پسندیدہ دین ہی تھا۔ اسلام اور دوسرے دینوں میں جو فرق ہوا ہے وہ نفس دین کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ ان کی تاریخی حیثیت کے اعتبار سے ہے۔

اصل یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کو جو دین ملا وہ بعد کے زمانہ میں اپنی اصل صورت میں محفوظ نہ رہ سکا۔ مختلف قسم کے بگاڑ کے نتیجہ میں وہ منزّل دین نہ رہا بلکہ وہ محرّف دین بن گیا۔ یہی حادثہ پچھلے تمام دینوں کے ساتھ پیش آیا۔ بعد کی نسلیں ان دینوں کی حفاظت نہ کر سکیں اس لئے انھوں نے اپنی تاریخی اعتباریت (historical credibility) کھو دی۔

مگر اسلام کا معاملہ استثنائی طور پر مختلف ہے۔ اسلام کے ساتھ اللہ کی خصوصی مدد سے ایسے اسباب اکٹھا ہوئے کہ اس کا متن (text) اور اس کا ابتدائی ریکارڈ (record) عین اپنی اصل حالت میں باقی رہا۔ کوئی شخص خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ اپنی گمراہی کا سامان کر سکتا ہے، مگر جہاں تک خود دین اسلام کا سوال ہے وہ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کی صورت میں کامل اور غیر مشتبہ طور پر آج بھی موجود ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اب وہ واحد دین ہے جس کو خدا کے مستند دین کی حیثیت

حاصل ہے۔ اس لئے آدمی پورے اعتماد کے ساتھ یہ کر سکتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے ذریعہ اپنا دین اخذ کرے اور یہ یقین کر سکے کہ اس نے اس دین کو پالیا ہے جو اللہ کے یہاں مقبول دین قرار پائے گا۔ جب کہ دوسرے ادیان تحریف اور تبدیلی کی بنا پر اپنی حیثیت کھو چکے ہیں۔

آج کی دنیا مذاہب کا جنگل بنی ہوئی ہے۔ تقریباً ایک درجن بڑے مذاہب اور سیکڑوں کی تعداد میں چھوٹے مذاہب دنیا میں موجود ہیں۔ مگر اسلام کے سوا کوئی بھی دوسرا مذہب نہیں جو تاریخ کے معیار پر اپنا استناد (authenticity) ثابت کر سکے۔ یہ خصوصیت استثنائی طور پر صرف اسلام کو حاصل ہے۔ اسلام بعد کے انسانوں کو یہ قیمتی موقع دیتا ہے کہ وہ یقین واعتماد کے ساتھ اسلام کو اختیار کر کے یہ یقین رکھے کہ وہ اللہ کی رحمتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔



اسلام اکیسویں صدی میں

ٹی۔ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب دعوت اسلام(The Preaching of Islam) انیسویں صدی کے آخر میں چھپی۔ اس کتاب میں مصنف نے ایک سے زیادہ بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اسلام جس تیزی سے مختلف ملکوں میں پھیل رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مستقبل قریب میں وہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔ دنیا کی بیشتر قوموں کی اکثریت دین اسلام میں داخل ہو جائے گی۔

مگر سو سال سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود، یہ واقعہ پیش نہیں آیا، جب کہ بظاہر حالات ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ۶۱۰ء میں پہلی وحی اتری۔ اس وقت اسلام ایک نئی دنیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد وہ نہایت تیزی سے چاروں طرف پھیلنے لگا۔ اسلام کی توسیع (expansion) کو ایک غیر مسلم مؤرخ نے تمام معجزوں سے بڑا معجزہ (miraculous of all miracles) قرار دیا ہے۔ اسلام کی اس تیز رفتار توسیع کا عمل اس کے آغاز کے بعد مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ ملک کے ملک اور قوموں کی قومیں اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئیں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں پہنچ کر یہ عمل تقریباً رک جاتا ہے۔ پوری بیسویں صدی گذر گئی اور کسی بھی قوم یا ملک میں یہ واقعہ پیش نہیں آیا کہ تمام کے تمام لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں، جیسا کہ پچھلی صدیوں میں ہوا تھا۔ اس "حادثہ" کا سبب کیا ہے۔ اس کے واحد ذمہ دار بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے وہ انقلابی مفکرین ہیں جنھوں نے اسلام کی سیاسی تفسیر کر کے مسلمانوں کو متشددانہ جہاد میں مشغول کر دیا۔ یہ واقعہ ایک ایسے دور میں ہوا جب کہ جدید میڈیا کا ظہور ہو چکا تھا۔ چنانچہ نئے دور کے مسلح مجاہدین کی گرم خبریں (hot news) جدید میڈیا کے ذریعہ ساری دنیا میں پھیلنے لگیں۔ یہاں تک اسلام کی تصویر لوگوں کی نظر میں یہ بن گئی کہ وہ

نفرت اور تشدد کا مذہب ہے۔ اس کے بعد لوگ اسلام سے متوحش ہوگئے، جب کہ اس سے پہلے وہ پر شوق طور پر اس کی طرف راغب ہو رہے تھے۔

ایک جائزہ

اس "حادثہ" کی تاریخ مزید پیچھے تک جاتی ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں قتال کے واقعات ہوئے۔ اولاً عرب کے سرداروں سے اور پھر ایرانی سلطنت اور رومی سلطنت سے۔ اس جنگ کو قرآن میں قتال برائے استیصال فتنہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ایک وقتی آپریشن (operation) تھا۔ اس کے ذریعہ یہ مطلوب تھا کہ مذہبی جبر (religious persecution) کا دور دنیا سے ختم ہو جائے اور اہل توحید کو یہ موقع ملے کہ وہ مذہبی آزادی کی فضا میں اپنی دینی اور دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

یہ گویا ایک خدائی آپریشن تھا۔ اس کا آغاز ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا۔ اور خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں تقریباً اس کی تکمیل ہوگئی۔ اب وہ وقت آگیا کہ اہل اسلام اس اصول کو اختیار کرلیں جس کو جاپانیوں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد عمل معکوس (reverse course) کا نام دیا تھا۔ یعنی پر تشدد عمل کا طریقہ چھوڑ کر پر امن عمل کا طریقہ اختیار کرنا۔

ابتدائی دور کے اہل اسلام میں بعض افراد ایسے ملتے ہیں جن کو اس حقیقت کا واضح شعور حاصل تھا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ اب مذہبی جبر ختم ہو چکا ہے۔ اس طرح وہ رکاوٹ دور ہو چکی ہے جس کو دور کرنے کے لئے قتال کیا گیا تھا۔ اس لئے اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ قتال کو چھوڑ کر اسلام کے ایجابی عمل میں مشغول ہو جائیں۔ یعنی دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کا میدان۔

اس سلسلہ میں پہلا قابل حوالہ قول وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد عبد اللہ بن زبیر کی جماعت اور بنو امیہ کے درمیان جو مسلح سیاسی ٹکراؤ ہوا، اس میں حضرت عبداللہ بن عمر شریک نہ تھے۔ اس وقت کچھ لوگ آپ کے پاس

آئے اور قتال فتنہ والی آیت کو یاد دلا کر کہا کہ آپ کو فتنہ کے استیصال کے لئے جنگ میں شرکت کرنا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے جواب دیتے ہوئے کہا: قاتلنا حتى لم تكن فتنة، وكان الدين لله، وانتم تريدون أن تقتلوا حتى تكون فتنة ويكون الدين لغير الله (فتح الباری لابن حجر، الجزء الثانی صفحہ ۳۲) یعنی ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا۔ اور دین اللہ کے لئے ہو گیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ تم جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ دوبارہ ہو جائے اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عبداللہ بن زبیر اور ان کے ساتھیوں نے بنو امیہ سے "اصلاح سیاست" کے نام پر جو جنگ کی وہ قرآن کے مطابق قتال فتنہ کی جنگ نہ تھی۔ اس سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ یکون الدین لِلّٰہ (دین اللہ کے لئے ہو جائے) کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاسی بگاڑ باقی نہ رہے، کیوں کہ وہ تو حضرت عبداللہ بن عمر کے زمانے میں وہاں موجود تھا۔ قرآنی آیت (یکون الدین للّٰہ) کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دینی زندگی گزارنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا قابل حوالہ قول وہ ہے جو اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے منقول ہے۔ ان کے زمانۂ خلافت میں کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس کو دیکھ کر آپ کے ایک حاکم (گورنر) کو یہ اندیشہ ہوا کہ یہ عمل اگر جاری رہا تو خراج کی رقم کم ہو جائے گی اور سرکاری خزانہ خالی ہو جائے گا۔ چنانچہ اس حاکم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ قبول اسلام کی اس لہر (wave) پر روک لگانا چاہئے۔ عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا: ويحك إن محمداً صلى الله عليه وسلم بعث هادياً و لم يبعث جابياً۔ (تمہارا برا ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے وہ خراج وصول کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے)۔

ایک روایت میں ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ایک عامل عدی بن ارطاط نے آپ کے نام ایک مکتوب روانہ کیا کہ لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ

خراج کی رقم کہیں کم نہ ہو جائے۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس کے جواب میں انہیں لکھا: **فهمت كتابك، والله لوددت أنّ الناس كلهم اسلموا حتى نكون انا وانت حرّاثين نأكل من كسب ايدينا** (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ۱۲۴) یعنی میں نے تمہارے خط کو سمجھا۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند ہے کہ تمام لوگ اسلام قبول کرلیں یہاں تک کہ میں اور تم ہل چلانے والے بن جائیں، ہم اپنے ہاتھ کی محنت سے کھائیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جو بات کہی وہ دوسرے لفظوں میں یہ تھی کہ استیصال فتنہ کے بعد اسلام مرحلۂ قتال سے نکل کر اب مرحلۂ دعوت میں آگیا ہے۔ اب ہمیں نہ لوگوں کی گردنیں کاٹنا ہے اور نہ ان سے خراج وصول کرنا ہے۔ بلکہ ہمیں پرامن دعوتی عمل کے ذریعہ تمام قوموں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل کرنا ہے۔

بدقسمتی سے بعد کے مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا نہیں ہوئے جو اس نقطۂ نظر کی عملی وضاحت کرکے اس کو ایک منظّم دینی فکر کی حیثیت دیتے۔ اور اس کو عمومی طور پر ملت کے شعور کا حصہ بنادیتے۔ اس بناپر ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں بھی مسلمانوں کی صفوں سے ایسے سیاسی حوصلہ منداٹھتے رہے جنہوں نے جنگ وقتال کے تسلسل کو باقی رکھا ــــــ امت کا ایک طبقہ اگرچہ بدستور دعوت واصلاح کے پرامن کام میں مشغول رہا مگر اسی کے ساتھ کچھ لوگوں نے شمشیر زنی اور ملک گیری کا کام بھی جاری رکھا۔

تاہم قدیم زمانہ کے شمشیر زنوں کا یہ عمل اسلام کی دعوتی توسیع میں کوئی بڑی رکاوٹ نہ ڈال سکا۔ کیونکہ قدیم حالات میں ان کا عمل اسلام کی عمومی بدنامی کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں کچھ ایسے مسلم مفکرین پیدا ہوئے جنہوں نے بطور خود اسلام کی سیاسی اور انقلابی تفسیر پیش کی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان چونکہ نئے حالات کے نتیجہ میں سیاسی محرومی کے احساس میں مبتلا تھے اس لئے ان کے درمیان اس ''انقلابی تفسیر'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ امت کا بڑا حصہ یا تو ذہنی طور پر متشددانہ طرز فکر میں مبتلا ہو گیا یا عملی طور پر متشددانہ

کارروائیوں میں۔

دور جدید کے ان "مجاہدین" نے اسلام کو جو نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کبھی کوئی نہیں پہنچا سکا تھا، حتیٰ کہ اسلام کے کھلے دشمن بھی اس قسم کا نقصان پہنچانے میں ناکام ثابت ہوئے تھے۔اس کا سبب موجودہ زمانہ کا تیز رفتار میڈیا ہے۔ پچھلے زمانہ میں تشدد کے کسی واقعہ کو صرف آس پاس کے چند لوگ جان سکتے تھے۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ زمین کے کسی بھی گوشے میں تشدد کا واقعہ ہو تو وہ اسی دن اپنی پوری تفصیل کے ساتھ پوری دنیا کے علم میں آجاتا ہے۔

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ بتوں کو برا نہ کہو، ورنہ ان کے پوجنے والے اللہ کو برا کہنے لگیں گے (الانعام ۱۰۸) اس آیت کی تفسیر کے تحت مفسر القرطبی نے لکھا ہے ـــــ علماء نے کہا ہے کہ اس کا حکم امت پر ہر حال میں باقی ہے، پس جب کافر طاقتور حالت میں ہوں اور یہ اندیشہ ہو کہ جواب میں اسلام کو یا پیغمبر کو یا اللہ کو برا بھلا کہا جائے گا تو کسی مسلم کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ ان کی صلیبوں کو اور ان کے دین کو اور ان کے عبادت خانوں کو برا بھلا کہیں اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جائے گا جس سے اس قسم کا منفی نتیجہ نکلے کیوں کہ ایسا فعل معصیت پر ابھارنے کے ہم معنی ہے: اور اس میں یہ دلیل ہے کہ صاحب حق اپنے حق سے رکا رہے گا جب کہ اس کا اقدام دین میں ضرر پہنچانے کا سبب بنے (الجامع الاحکام القرآن للقرطبی، الجزء السابع صفحہ ۶۱)

یہ اسلام کی ایک نہایت اہم ہدایت ہے۔ وہ مسلمانوں کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری قرار دیتی ہے کہ وہ کسی عملی اقدام سے پہلے اس کے نتیجہ کے بارے میں اچھی طرح غور کریں، خواہ یہ اقدام بظاہر بالکل درست کیوں نہ ہو جب کہ اس کے نتیجہ میں خدا کے دین کو کوئی نقصان پہنچنے والا ہو۔

بیسویں صدی عیسوی میں تقریباً ساری دنیا میں مسلمانوں کی طرف سے کئی ایسے ناعاقبت اندیش اقدامات کئے گئے جو واضح طور پر اس حکم اسلام کی خلاف ورزی تھے مثلاً ملک ومال کے لئے

طاقتور قوموں کے خلاف مسلح جنگ چھیڑنا، مسلم حکمرانوں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف متشددانہ جہاد کرنا۔ توہین اسلام کے نام پر اس کے مرتکبین کے خلاف قتل کے فتوے صادر کرنا، وغیرہ۔

اس قسم کی مختلف کارروائیاں جدید انسان کے لئے تشدد (violence) کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور تشدد آج کے انسان کے نزدیک عام جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے۔ چونکہ یہ واقعات جدید میڈیا کے زمانہ میں ہو رہے تھے، وہ فوراً پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ تمام دنیا میں پھیل گئے۔ نتیجہ اپنی بدترین صورت میں وہی نکلا جس کا ذکر قرآن کی مذکورہ آیت میں کیا گیا ہے، یعنی اسلام کی بدنامی، چنانچہ اس کے بعد یہ ہوا کہ دنیا بھر کے لوگ اسلام کو برا بھلا کہنے لگے۔ تمام لوگوں کی نظر میں اسلام ایک ایسا مذہب بن گیا جو نفرت اور تشدد کی تعلیم دیتا تھا، اور اس بنا پر وہ ان کے لئے قابل قبول نہ تھا۔

کسی عمل کو شروع کرنے کے سلسلہ میں صرف یہ دیکھنا کافی نہیں کہ وہ بظاہر درست ہے یا وہ اپنے ایک جائز حق کے لئے اٹھنا ہے۔ اسی کے ساتھ لازمی طور پر یہ دیکھنا چاہئے کہ حالات موجودہ (given situation) میں اس کی طرف اقدام کرنا کس قسم کا نتیجہ برآمد کرے گا، اگر یہ یقین ہو کہ وہ مطلوب نتیجہ تک پہنچائے گا تو اس کے لئے اقدام کرنا چاہئے۔ بے نتیجہ اقدام کرنے سے بہتر یہ ہے کہ سرے سے کوئی اقدام ہی نہ کیا جائے۔

اسلام انسانی فطرت کا دین ہے۔ وہ ہر آدمی کے دل کی آواز ہے۔ اسلام اپنی امتیازی صفات کی بنا پر اس قابل ہے کہ ہر آدمی اس کو قبول کرے، وہ ہر آدمی کے لئے اس کی داخلی طلب کا جواب بن جائے، پچھلی صدیوں میں اسلام کو جو عمومی قبولیت حاصل ہوئی وہ اسی حقیقت کا ایک تاریخی ثبوت ہے۔ آج بھی یہ تاریخ دوبارہ ظہور میں آسکتی ہے، بشرطیکہ اسلام کے اوپر سے بدنامی کا مصنوعی پردہ ہٹا دیا جائے۔

اسلام اکیسویں صدی کا مذہب ہے۔ اسلام کو بلاشبہ اپنی فکری فتوحات کے ساتھ اکیسویں

صدی میں داخل ہونا چاہئے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اسلام کے اس فاتحانہ مارچ میں اس کے راستے ہموار کریں یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے یہاں اس کی نصرت کرنے والے قرار پائیں گے۔ اور اللہ کی ابدی جنتوں میں داخل ہوں گے۔ بلاشبہہ اس سے بڑی اور کوئی کامیابی نہیں۔



اعلان

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ (انڈیا) میں ۱۹۴۷ سے پہلے ایک استاد تھے۔ ان کا نام مولانا سعید احمد ندوی تھا۔ ایک حوالہ کے سلسلہ میں ان کی تاریخ وفات درکار ہے۔ جن صاحب کو اس کا علم ہو، براہ کرم وہ خط کے ذریعہ مطلع فرمائیں۔ کسی صاحب کو مولانا مرحوم کے وطن کا علم ہو تو وہ بھی بذریعہ خط اطلاع دیں تاکہ ان کے وطن سے معلومات حاصل کی جا سکیں۔

ادارۂ الرسالہ

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

ISLAMIC BOOKS